روح کا روگ

طِبّ و نفسیات کے پس منظر میں بارہ سچی کہانیاں

ڈاکٹر ممتاز حسین بھٹی ایم۔بی۔بی۔ایس

راشدہ تبسم ایم۔اے (نفسیات)

فہرست

ڈاکٹر ممتاز حسین بھٹی ایم۔بی۔بی۔ایس

پیش لفظ

بارہ کہانیوں کے اِس مجموعے میں پانچ کہانیاں ایک ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر نے اور سات ایک خاتون نے جو ایم۔اے (نفسیات) ہیں، قلمبند کی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز حسین بھٹی عمر کے اُس حصّے میں جا پہنچے ہیں جہاں پریکٹس ممکن نہیں رہی۔ ڈاکٹر صاحب پُرانے طریقۂ علاج کے حامی ہیں۔ وہ جب پریکٹس کرتے تھے تو ایسے مریضوں کے گھریلو اور نفسیاتی پس منظر کو بڑے غور سے دیکھتے تھے جو دوائیوں سے صحت یاب نہیں ہوتے تھے۔ وہ اس نظریئے کے قائل ہیں کہ کئی جسمانی امراض کا باعث نفسیاتی ہوتا ہے۔ نفسیاتی نقص کو رفع کئے بغیر جسمانی مرض کا علاج نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر ممتاز حسین بھٹی کے یہ کیس محترم نصر اللہ قریشی نے قلمبند کئے ہیں۔

محترمہ راشدہ تبسّم نے پانچ سال گزرے نفسیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک سے باہر ہیں۔ انہوں نے چار دیواری کی دُنیا میں جا کر چند ایک ابنارمل خواتین کے ساتھ علمِ نفسیات کی روشنی میں لمبی لمبی ملاقاتیں کیں اور اُن کی کہانیاں قلمبند کیں۔

راشدہ تبسّم کہتی ہیں؛

"کیا وعظ اور لیکچروں سے اخلاق اور کردار کو سُدھارا جا سکتا ہے؟ ــــ سائیکالوجی اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ سائیکالوجی اپنا یہ اصول بتاتی ہے کہ انسان کی ذات میں نیکی یا نیک اوصاف موجود ہوتے ہیں، اور یہ اُس وقت بھی موجود

ہوتے ہیں جب انسان کوئی بدی کر رہا ہوتا ہے، چوری کر رہا ہوتا ہے، کسی کو قتل کر رہا ہوتا ہے، جھوٹ بول رہا ہوتا ہے، رشوت لے رہا ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ جو حرکت کر رہا ہے اُسے یہی حرکت کرنی چاہیئے....

"سائیکالوجی یعنی علمِ نفسیات کا یہ اصول اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے کہ انسان کو خدا نے نیکیوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اسے خدا نے قوّت دی ہے کہ وہ بدی کو یعنی شیطان کو شکست دے سکتا ہے۔ حالات اور ماحول انسان پر عجیب وغریب طرح اثر انداز ہوتے ہیں لیکن انسان بیدار ہو جائے تو وہ اِن اثرات سے آزاد ہو سکتا ہے اور اپنی زندگی کو جنّت بنا سکتا ہے۔"

راشدہ تبسّم کہتی ہیں کہ ہمارے معاشرے کی بنیادی خرابی ایک ہی ہے ــــ جھوٹ! ــــ اسی میں سے باقی سب قباحتیں پھوٹتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔

یہ بارہ کہانیاں بظاہر ابنارمل کرداروں کی ہیں لیکن غور کریں تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنہیں نارمل کہا جا سکے۔ یہ کہانیاں پڑھیں۔ ان میں سے بعض کہانیاں قابلِ یقین نہیں لگتیں لیکن یہ سچّی کہانیاں ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ انسان نیکی پر اُتر آئے تو اس کی کوئی حد نہیں، اور اگر بدی کی پستیوں میں اُتر جائے تو ان پستیوں کی کوئی تہہ نہیں۔

ان کہانیوں کے کچھ پہلو اور بھی ہیں۔ ہم مزید تبصرے سے گریز کریں گے۔ کہانیاں پڑھیئے۔ آپ صرف چونک ہی نہیں اُٹھیں گے بلکہ گہری سوچ میں کھو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے ان کہانیوں میں آپ کو اپنے نفسیاتی نقائص نظر آجائیں اور آپ دوائیوں سے نجات حاصل کر لیں۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

پیلنوں کا سانپ

چار دیواری کی دُنیا کے جو راز ڈاکٹر کے سینے میں ہوتے ہیں، ان سے ہم اور آپ بھی واقف نہیں ہوتے، حالانکہ ہم اسی چار دیواری کے پروردہ ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز حسین بھٹی کی عمر ستّر برس ہوگئی ہے۔ تجربہ کار معالج ہیں لیکن ان کے کلینک میں مریضوں کی وہ بھیڑ نہیں ہوتی جو دوسرے ڈاکٹروں کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ ابھی تک پُرانے طریقۂ علاج کو اپناتے ہوئے ہیں۔ اگر ان کا کوئی مریض اتنے دِنوں میں صحت یاب نہ ہو جتنے دنوں کی انہیں توقع ہوتی ہے تو وہ مریض کا نفسیاتی اور گھریلو پس منظر کھنگالنے بیٹھ جاتے ہیں اور اتنا وقت صَرف کر دیتے ہیں کہ انتظار میں بیٹھے ہوئے مریض تنگ آکر اُٹھ جاتے ہیں۔

میرا اُن سے تعارف ہُوا تو میری پہلی رائے یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب سنکی اور جنونی ہیں لیکن ملاقاتیں بڑھیں تو وہ کچھ اور نکلے.... اُن کی شخصیت تجسّس، محبت اور ہمدردی سے عبارت ہے۔ ایک روز انہوں نے مجھے اپنی ایک مریضہ کا کیس سُنایا تو میں چونکا۔ مَیں نے سارا کیس سُن کر انہیں کہا کہ وہ اجازت دیں تو میں یہ کیس "حکایت" میں چھپوا دوں۔ اُنہوں نے اجازت دے دی اور یہ بھی کہا کہ کوئی لکھنے والا مل جائے اور کوئی پرچہ چھاپنے کے لئے آمادہ ہو جائے تو وہ ایسے کیس سنائیں گے جو لوگوں کے کام آئیں گے۔ اُنہوں نے کہا کہ بہت سی بیماریاں گھروں کے تلخ حالات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

"ہماری سوسائٹی میں عورت مظلوم ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا

ـــ"مرد گھٹیا ہو، غبی اور پسماندہ ذہن کا ہو، وہ اپنی بیوی کو، خواہ وہ روشن خیال اور ایثار کا مجسمہ ہو، زر خرید لونڈی سمجھتا ہے۔ اس قسم کے خاوندوں کی بیویاں جلتی اور کڑھتی ہیں، اپنا خون جلاتی ہیں اور اس سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، ان کا علاج دوائیوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ آج کل ڈاکٹروں نے ان بیماریوں کو اعصاب زدگی اور ڈیپریشن کا نام دے دیا ہے اور ان میں مبتلا عورتوں کو نشہ آور گولیاں کھلائے چلے جا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس کے ساتھ ہی ایک مریضہ کا کیس سنانا شروع کر دیا جو آگے چل کر جرم و جاسوسی کی کہانی بن گیا۔ ڈاکٹر بھٹی نے کہا ـــ "ایسے کئی کیس ہوتے ہیں جن کے انجام اس سے بھی زیادہ بھیانک ہوتے ہیں لیکن کوئی نہیں دیکھتا کہ اس انجام کا ذمہ دار کون ہے۔ بعض خواتین خودکشی کر لیتی ہیں اور بعض کو پاگل خانے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے چوبیس پچیس سال پرانا کیس سنایا جو میں اپنے الفاظ میں سُناتا ہوں۔ اُن کے پاس ایک جوان اور شادی شدہ مریضہ علاج کے لئے آئی۔ اُس کا خاوند ساتھ تھا۔ اُس کا نام آپ زہرہ اور خاوند کو حامد کہہ لیں۔ زہرہ نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اُس کا سر ہمیشہ درد کرتا ہے۔ طبیعت بوجھل رہتی ہے۔ بھوک بہت کم لگتی ہے اور اس کے پیٹ میں کبھی کبھی درد کی لہر اُٹھتی ہے اور کچھ دیر بعد ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ دوائیاں دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نوٹ کیا کہ مریضہ کا خاوند اُس کی ہر بات میں دخل دیتا اور ظاہر کرتا تھا جیسے اُسے اپنی بیوی کا بہت ہی خیال ہو لیکن اس میں بناوٹ زیادہ تھی۔ مریضہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن حامد نے اُسے کہا ـــ "چلو اب، ڈاکٹر صاحب کو دوسرے مریض بھی دیکھنے ہیں" ـــ اور وہ اُس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

دو روز بعد وہ پھر آئی۔ اب کے اُس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا اور آنکھیں سُرخ تھیں۔ اُس نے پہلے والی شکایات بیان کیں۔ اُس کا خاوند اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ اُسے رات کو نیند تو ٹھیک سے آتی ہے؟

وہ چونک پڑی لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہچکچا رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی مشفقانہ اور ہمدردانہ باتوں سے حوصلہ لے کر اُس نے کہا ـــ "مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ میں سوتے میں ہڑبڑا کر اُٹھتی ہوں۔ بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھتی ہوں۔ شاید میری بیماری کا سبب یہی خواب ہے۔"

"خوابوں کا تعلق انسان کی زندگی پر بہت گہرا ہوتا ہے" ـــ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا ـــ "خواب انسان کی زندگی کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ خوابوں کا ایک الگ علم ہے جسے کسی حد تک ہر ڈاکٹر کے لئے جاننا ضروری ہے۔ مذاہب عالم میں اور الہامی کتابوں میں بھی خوابوں کا ذکر ملتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی خوابوں کا ذکر ہے۔ خواب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ انسان کی محرومیاں، اس کی نفسیاتی اور جنسی تشنگی اور اس کے خوف بھی خوابوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ خوابوں کے ذریعے اپنی زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انسان کے ذہن لاشعور میں چھپے ہوتے عزائم اور پھر سماجی سطح پر ندامت اور شرمندگی کا اظہار بھی خوابوں کی شکل اختیار کر کے انسان کی زندگی کو تلخ اور جسم کو مریض بنا دیتا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے زہرہ سے کہا کہ وہ ان کے وقت اور مصروفیت کا خیال نہ کرے اور اپنا خواب پورے کا پورا سُناتے۔ کوئی ایک بھی بات چھپا کر نہ رکھے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ مریضہ کے مرض کا سبب یہ خواب ہے یا وہ مرض کے اثر سے یہ خواب دیکھتی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں روزانہ ایک ہی خواب دیکھتی ہوں" ـــ زہرہ نے کہا ـــ "اب تو یہ خواب میں دن میں جاگتے میں بھی دیکھنے لگی ہوں۔ ایک سانپ ہے۔ چمکدار چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ زبان منہ سے بار بار نکلتی ہے۔ اس کی سُی سُی، جیسی آواز مجھ پر لرزہ طاری کر دیتی ہے۔ وہ سانپ مجھے گھورتا ہے۔ پھر رینگتے رینگتے میرے بازو، میرے گلے، میرے سر اور میرے جسم کے دوسرے حصوں پر چلتا رہتا ہے۔ میں خوف سے گم سُم ہو جاتی ہوں۔ میرا جسم پسینے سے بھیگنے لگتا ہے۔ پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ کئی بار تو وہ سانپ

مجھے ڈسنے بھی لگتا ہے جس سے چیخ اُٹھتی ہوں۔"

زہرہ خواب بیان کر کے خوف سے کانپنے لگی۔ ڈاکٹر بھٹی اُس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اُن کے لئے ضروری ہو گیا تھا کہ مریضہ کے گھریلو حالات اور ماضی کے بارے میں معلوم کریں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ ہو سکتی ہے؟

"ڈاکٹر صاحب! میرے ساتھ تو بات کرنے والا بھی کوئی نہیں"۔ اُس نے کہا — "میں سارا دن بیزار اور بور رہتی ہوں"۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی اُداسی دکھائی دے رہی تھی جیسے اُسے دُنیا میں کسی سے ہمدردی کی اُمید نہ ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سے بہت سے سوال کئے۔ بہت سی باتیں پوچھیں جن کا جواب اُس نے کبھی ہچکچاتے ہوئے کبھی شرماتے اور کبھی رُکتے رُکتے دیا۔ جو کچھ اُس کے بارے میں معلوم ہو سکا وہ یوں تھا کہ زہرہ خوشحال گھرانے کی اکلوتی اولاد تھی۔ ناز و نعمت میں پلی اور جوان ہوئی تھی، اس لئے والدین اُس کی ہر خوشی کا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے زہرہ کو اچھی تعلیم دلوائی۔ وہ بی۔اے میں پڑھتی تھی جب اس کی ملاقات اور جان پہچان حامد سے ہوئی۔ دونوں ہم جماعت تھے۔ ملاقاتیں بڑھ گئیں اور وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کے نقصانات ہی سامنے آئے ہیں۔ یہ طرزِ تعلیم ہمارے ملک کے لئے موزوں نہیں۔ نوجوان لڑکیاں ناتجربہ کار ہوتی ہیں۔ جذبات کو اپنے اُوپر غالب کر لیتی ہیں۔ خوبصورت لڑکوں کی کشش اور میٹھی باتوں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ وہ اچھی طرح جان بھی نہیں سکتیں کہ ان کا کردار کیسا ہے۔ وہ کیسا انسان ہے۔ مستقبل میں کیسا ثابت ہوگا۔ ایسے ہی زہرہ اور حامد کے تعلقات بڑھ گئے اور انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ زہرہ کے گھر والے زہرہ کی شادی اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے۔ زہرہ کو معلوم تھا کہ اُن کی نظر کس پر ہے لیکن زہرہ کی نگاہ میں وہ سیدھا سادہ کاروباری نوجوان تھا جسے دل لبھانے والی باتیں نہ آتی تھیں۔ وہ حامد کے مقابلے میں خوبصورت بھی کم تھا۔

زہرہ جانتی تھی کہ اُس کے والدین حامد کے ساتھ اُس کی شادی نہیں ہونے دیں گے۔ کچھ اُس کے اپنے بے قابو جذبات تھے، کچھ بچپن سے وہ ضدی تھی۔ اُس کی ہر خواہش اس کی مرضی کے مطابق پوری ہوتی رہی تھی اس لئے ضد اُس کی طبیعت میں شامل تھی۔ کچھ حامد نے اُسے ورغلایا، محبت اور اپنی امارت کے سہانے خواب دکھاتے۔ ماں باپ سے بات ہوتی تو اُنہوں نے زہرہ کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اُسے کسی اجنبی کے ساتھ نہیں بیاہیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز زہرہ گھر سے خاصا زیور اور نقدی لے کر چوری چھپے حامد کے ساتھ نکل بھاگی۔ حامد اُسے اپنے شہر لے آیا۔ یہاں آکر زہرہ اور حامد نے فی الفور شادی کر لی۔ حامد کا گھرانہ خوشحالی کے اعتبار سے زہرہ کے گھرانے سے کمتر تھا۔ امیری والی کوئی بات نہیں تھی۔ معمولی سا گھرانہ تھا۔ حامد کے والدین نے اس شادی پر نہ خوشی کا اظہار کیا نہ ناراضی کا۔ چند دنوں میں ساری بات کھُل گئی۔ وہ حامد کی مخالفت کرنے کے لئے تیار نہ تھے لیکن اُن کا بوجھ بھی اُٹھانے کے لئے رضامند نہ ہو رہے تھے۔ یوں چند دنوں کے بعد حامد نے چھوٹا سا ایک مکان کرائے پر لے لیا اور زہرہ کو لے کر وہاں اُٹھ آیا۔

زہرہ نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ اُسے اپنی شادی بہت عجیب لگی۔ ہر لڑکی کے ذہن میں شادی کا ایک دلکش تصور ہوتا ہے۔ ڈھولک، گیت، برادری اور سہیلیوں کی گہماگہمی، شادی کی رسمیں، مہندی، باجے گاجے، بارات، جہیز، رخصتی لیکن یہاں تو کچھ بھی نہ ہُوا تھا۔ زہرہ کو بار بار اپنی امی یاد آتی تھی جو اُسے کہا کرتی تھیں کہ وہ اُس کی شادی بڑے چاؤ اور بڑی دھوم دھام سے کریں گی۔ وہ سوچتی اگر اُس کی شادی گھر میں ہوتی تو اُس کے والدین کتنے خوش ہوتے مگر انہیں غم اور شرمندگی ملی۔ اُس کے دل میں اپنی غلطی کا احساس جڑ پکڑنے لگا۔ اُدھر حامد کے بارے میں بھی اُس کی رائے غلط نکلی۔ اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ملازمت مل نہ رہی تھی۔ ملازمت مل بھی جاتی تو چند سو روپلوں کی ملازمت سے کیا ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ زہرہ

جذبات سے نکل کر حقیقت میں آئی تو اُسے حامد اصلی روپ میں نظر آیا۔ وہ اُن باتوں سے بہت مختلف تھا جو وہ کالج میں کیا کرتا تھا۔

زہرہ کو مختلف طرح کے فکروں اور سوچوں نے گھیر لیا۔ وہ سوچتی، کیا بنے گا۔ اُس کی زندگی کیسے کٹے گی۔ وہ اپنے والدین سے ملنے کے لئے تڑپنے لگی۔ اُس کا بچپن بیدار ہوگیا۔ وہ اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرانے لگی۔ اپنی غلطی کا احساس اُسے بے چین رکھتا تھا۔ وہ اس محلّے میں بھی نئی تھی۔ کسی سے بے تکلفی نہ ہوتی۔ کسی کے ہاں آنا جانا بھی نہ تھا۔ خود اُسے بھی شرم آتی کہ اگر کسی نے اُس کے والدین کے بارے میں پوچھ لیا تو وہ کیا بتائے گی۔ وہ سوچوں میں گم اُداس اور بیزار زندگی گزارنے لگی۔ ڈاکٹر بھٹی نے مجھے بتایا کہ یہ احساسِ گناہ کے اثرات تھے جو زہرہ کو اندر ہی اندر کھانے لگے تھے۔

ایک دن حامد نے اُسے کہا کہ نوکری تو ملتی نہیں، کیوں نہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرلے۔ سمجھدار زہرہ اُس کا اشارہ سمجھ گئی۔ وہ اپنے گھر سے جو زیور لائی تھی وہ اُس نے حامد کے حوالے کر دیا۔ کچھ نقدی جو بچ گئی تھی وہ بھی حامد کو دے دی۔ حامد نے زیور بیچ کر چھوٹا سا ایک جنرل سٹور کھول لیا۔ وہ زبان کا جادو چلانا جانتا تھا۔ اس سے اُس نے دکان چلا لی، لیکن زہرہ گھر میں تنہا رہ گئی۔ حامد صبح دکان پر جاتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔ دونوں میں بات چیت برائے نام رہ گئی۔ اپنی شادی اور مستقبل کی زندگی کے بارے میں زہرہ نے جو خواب دیکھے تھے، وہ ٹوٹ کر رہ گئے۔ وہ اپنے والدین کو یاد کرتی۔ اپنے کئے پر پچھتاوا پہلے سے زیادہ ہوگیا۔ وہ زیادہ وقت کُڑھنے اور پچھتانے میں گزارنے لگی۔ اس سے اُسے مستقل سر درد شروع ہوگیا۔ کبھی کبھی پیٹ میں درد ہونے لگتا۔ کچھ اور وقت گزرا تو اُسے خواب میں سانپ دکھائی دینے لگا۔

ڈاکٹر بھٹی زہرہ کا اصل مقصد سمجھ گئے۔ وہ احساسِ جُرم میں مبتلا تھی لیکن جو کچھ وہ کر چکی تھی، اس کی تلافی نہ ہو سکتی تھی۔ والدین کے اعتماد کو دھوکا دینے،

مرضی سے شادی کرنے اور ایک غیر مطمئن زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اُس کو خواب میں سانپ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ سانپ اس کی محرومیوں اور غلطی کی علامت بن چکا تھا۔ وہ شعوری طور پر محسوس کر رہی تھی کہ حامد کے ساتھ اُس کی شادی نے اس کی ساری خوشیوں کو ڈس لیا ہے۔ اُسے یہ احساس اور زیادہ پریشان کرتا تھا کہ لوگ اُس کے ماں باپ پر اُنگلیاں اُٹھاتے ہوں گے۔ انہیں بدنام کرتے ہوں گے کہ ان کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اگر حامد اُس کی دلجوئی کرتا رہتا اور اُسے جذباتی سہارا دیتا رہتا تو وہ اپنے ضمیر پر اتنا زیادہ بوجھ نہ ڈالتی مگر حامد دکان کے بہانے اُس سے دُور ہٹتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اُس کا علاج شروع کیا۔ اُس کو حوصلہ دیا پھر سوچ سمجھ کر ایک دن اُس کے خاوند حامد کو بُلایا۔ اُسے سمجھایا کہ اُس کی بیوی بیمار ہے۔ اس کا جسمانی عارضہ تو دُور ہو سکتا ہے لیکن اس کو جو نفسیاتی مرض لاحق ہوگیا ہے اس کا علاج اُس کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ انہوں نے حامد کو مشورہ دیا کہ وہ زہرہ کو ساتھ لے کر اُس کے والدین کے پاس جاتے اور دونوں اُن سے معافی مانگیں۔ زہرہ کے والدین کے دل بھی دُکھی ہوں گے۔ وہ اپنی اکلوتی بچّی کی یاد میں تڑپ رہے ہوں گے۔ اگر حامد اور زہرہ پیش قدمی کریں گے تو وہ ان کو معاف کر دیں گے اور یہ اقدام زہرہ کے لئے صحت مند ثابت ہوگا۔

حامد نے بات مان لی اور وہ چلے گئے۔ آٹھ دس روز بعد زہرہ اکیلی ڈاکٹر صاحب کے پاس آئی اور ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اُس کے خاوند کو ایسا مشورہ دیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے والدین اُسے اور حامد کو دیکھ کر پہلے کچھ خفا ہوتے۔ جب حامد نے معافی مانگی اور اُن کے پاؤں پکڑ لئے تو اُن کے دل پسیج گئے۔ انہوں نے انہیں معاف کر دیا۔ زہرہ نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے باپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ جائداد کا کچھ حصہ اُس کے نام کر دے گا اور شاید کچھ رقم بھی دے گا جو حامد کی دکان کے کام آئے گی۔ زہرہ اُن کی واحد اولاد تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ انہیں

اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ زہرہ کو جائیداد اور رقم ملے گی، ان کی دلچسپی زہرہ کی صحت کے ساتھ تھی۔ وہ اُس کے چہرے پر رونق دیکھ رہے تھے۔

"اب تمہیں وہ سانپ تو خواب میں دکھائی نہیں دیا؟" ڈاکٹر صاحب نے اُس سے پُوچھا۔

"میں نَو دن اپنے والدین کے گھر رہی۔ وہاں صرف ایک بار وہ خواب دیکھا۔ کل رات ہم واپس آئے تو رات کو پھر مجھے وہی خواب دکھائی دیا۔"

ڈاکٹر بھٹی نے اُسے کہا کہ ایک وقت آئے گا کہ وہ پھر کبھی ایسا خواب نہیں دیکھے گی۔

زہرہ اس کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس آتی رہی۔ کبھی وہ خوش ہوتی، کبھی بیزار اور اُداس۔ وہ اُن دِنوں بہت خوش ہوتی جب وہ اپنے والدین سے مل کر آتی تھی۔ اب وہ ہر دوسرے مہینے دس پندرہ دنوں کے لئے اپنے والدین کے گھر چلی جاتی تھی۔ حامد کا یہ روّیہ اچھا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو خوش اور صحت مند رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا، لیکن بعض اوقات ڈاکٹر صاحب حامد سے ملتے تو محسوس کرتے جیسے اُس نے اپنے اُوپر کوئی خول چڑھا رکھا ہے۔ اُس کی گفتگو اور روّیے میں تصنع صاف دکھائی دیتا تھا۔

زہرہ زیرِ علاج رہی۔ اب وہ سانپ کا خواب کبھی کبھی دیکھتی تھی۔ ہر رات نہیں۔ سر درد میں کمی آگئی تھی۔ پیٹ کا درد ختم ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی صحت گر رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر بیزاری سی دکھائی دیتی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب بھی پوچھا کہ اب اُسے کیا دُکھ ہے تو وہ یُوں ٹال گئی جیسے کچھ چھپا رہی ہو۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ تھی کہ اُس کے اعصاب خاصے کمزور ہو چکے تھے اور اُس کا بلڈ پریشر بھی بڑھ رہا تھا لیکن وہ اب ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پُوری طرح تعاون نہ کر رہی تھی۔ حامد نے تو ڈاکٹر صاحب سے مِلنا جُلنا ہی ترک کر دیا تھا۔ اُس کے ایک دو جاننے والوں سے پتہ چلا کہ وہ زہرہ سے لاپرواہ ہو گیا ہے۔ اُس کی دکان پر لڑکیوں اور عورتوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے کیونکہ

اُس کی دکان میں سامان ہی ایسا ہے۔ وہ عورتوں میں بڑی دلچسپی لیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو زہرہ کی اُداسی کی وجہ معلوم ہوگئی۔ انہیں زہرہ کے ساتھ ہمدردی پہلے سے زیادہ ہو چکی تھی۔

چند دنوں بعد ڈاکٹر بھٹی کلینک میں آتے تو ایک مریض نے انہیں بتایا کہ اُن کی مریضہ زہرہ رات دل کا دَورہ پڑنے سے مر گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب حیران و ششدر رہ گئے۔ وہ مان نہیں سکتے تھے کہ زہرہ دل کے دَورے سے مری ہے۔ وہ دل کی مریضہ نہیں تھی۔ پانچ سات روز پہلے وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس آئی تھی۔ وہ بہت اُداس تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پُوچھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔ کیا سانپ پھر پریشان کرنے لگا ہے؟ اُس کے آنسو بہہ نکلے اور وہ آہ لے کے بولی — "میری خوشیوں کو کسی ناگن نے ڈس لیا ہے .... میں خواب میں جس سانپ کو دیکھتی رہی ہوں وہ حامد کے رُوپ میں سامنے آگیا ہے" — اور وہ اپنی کوئی تکلیف بتاتے اور دوائی لئے بغیر چلی گئی تھی۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں کہ لوگ مجھے سنکی، وہمی اور جنونی کہا کرتے ہیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میں ہر انسان اور ہر بات کی تہہ تک چلا جایا کرتا ہوں" — ڈاکٹر صاحب نے کہا — "میں حامد اور زہرہ کے دِلوں میں بھی اُتر چکا تھا۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آرہا تھا۔ ایک ایس۔ پی میرا گہرا دوست ہے۔ میں نے اُسے فون پر بتایا کہ ایک جوان لڑکی مر گئی ہے جو اگر خودکشی نہیں تو قتل کی واردات ہے۔ ایس۔ پی کو میں نے ساری بات بتائی۔ اُس نے مجھے یہ نصیحت کر کے ٹالنے کی کوشش کی کہ خواہ مخواہ کسی کے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہیئے لیکن میرے اصرار پر وہ مان گیا۔ اُس نے علاقے کے پولیس سٹیشن کے انسپکٹر انچارج کو حکم دیا کہ وہ اس کیس کی تفتیش کرے اور اگر اُسے شک گزرے تو لاش کو قبضے میں لے کر پوسٹمارٹم کرائے۔

ڈاکٹر صاحب حامد کے گھر چلے گئے اور فوراً بعد ایک تھانیدار آگیا۔

اُس نے جب کہا کہ وہ لاش دیکھنا چاہتا ہے تو وہاں جو لوگ جمع تھے، اُن پر سناٹا طاری ہو گیا۔ حامد نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا تو اُن کے گلے سے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اُس کا رونا دکھاوے کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ زہرہ پاگل ہو رہی تھی۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھی۔ رات کو اُسے دل کا دَورا پڑا اور مر گئی۔ پولیس انسپکٹر کو دیکھ کر وہ خاصا پریشان ہو رہا تھا۔ اُس نے زہرہ کے والدین کو بذریعہ تار اطلاع دے دی تھی۔

تھانیدار نے لاش کا معائنہ کیا اور لاش کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اُسے ضرور کچھ شک ہوا تھا۔ حامد نے واویلا بپا کر دیا کہ پولیس اُسے پریشان کر رہی ہے۔ وہ تھانیدار کو الگ لے گیا۔ شاید وہ رشوت پیش کر رہا تھا لیکن تھانیدار کو ایس۔پی کا حکم ملا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اس کیس کو دبا نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی لاش کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر مرنے والی کا آخری تاثر موجود تھا۔ یہ تکلیف کا تاثر تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لاش کی شہ رگ پر ایک ہلکا نیلا نشان بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ چونکہ ڈاکٹر ہیں اس لئے انہیں یقین ہو گیا کہ زہرہ مری نہیں اسے مارا گیا ہے۔

ڈاکٹر بھٹی نے مجھے بتایا کہ اُن کے کانوں میں دو قسم کی باتیں پڑنے لگیں۔ ایک توہمات کی اور دوسری حقیقت کی۔ مریض جو ڈاکٹر صاحب کے پاس آتے ان سے ڈاکٹر صاحب انجان بن کر پوچھتے کہ اُن کے محلّے میں یہ کیا واقعہ ہو گیا ہے۔ مریض انہیں بتاتے کہ زہرہ کا ذہنی توازن صحیح نہیں تھا۔ بعض کہتے کہ اُس پر جنّات کا قبضہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے مولوی صاحب اور ایک عامل کے حوالے سے بات کرتے تھے۔ عورتوں کی رائے یہ تھی کہ لڑکی میں کوئی آسیبی گڑبڑ تھی۔ صرف ایک روشن خیال اور واقفِ حال آدمی تھا جس نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ حامد ہی اپنی بیوی کی موت کا ذمہ دار ہے۔ اُس کی دکان میں میک اپ کا سامان اور چوڑیاں وغیرہ تھیں۔ اس سامان کے ذریعے اُس نے کوئی اور ہی کرتوت شروع کر رکھی تھی اور اپنی بیوی کے ساتھ اس

کا تعلق صرف اشارہ گیا تھا کہ دونوں ایک مکان میں رہتے تھے۔

یہ شخص حامد کے گھریلو حالات سے پوری طرح واقف تھا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ حامد اس لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ لڑکی خوشحال گھرانے کی تھی اور حامد کے گھر میں دو وقت کی روٹی پوری ہوتی تھی۔ خاندانی لحاظ سے بھی وہ کوئی اُونچا آدمی نہیں تھا۔ اُسے لڑکی کے ساتھ زیور اور رقم مل گئی جس سے دکان چل نکلی۔ حامد کا ذہن اپنے خاندانی پس منظر کے مطابق بہت چھوٹا تھا۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے کہ اُس کے دن پھر گئے ہیں، اُس کا دماغ پھٹ گیا اور وہ اُونچی ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ پھر اُس کی بیوی کے والدین نے اُس کی مالی مدد شروع کر دی مگر اُن کی بیٹی کے لئے اُس نے گھر کو جہنم بنائے رکھا۔ لڑکی نے تنگ آکر خودکشی کر لی۔

ڈاکٹر صاحب کے کانوں میں حقیقت کی باتیں تھانے سے معلوم ہوئیں۔ اُن کے ایس۔پی دوست نے انہیں ایک روز فون پر کہا ــــ ”میں نے تو آپ کی دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے کارروائی کرائی تھی لیکن شک آپ ہی کا صحیح نکلا۔ تھانیدار نے ابھی ابھی اطلاع دی ہے کہ اُس نے حامد سے اقبالِ جرم کرا لیا ہے۔ اُس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے مجھے حامد کا جو اقبالِ جرم سنایا وہ حامد کی زبانی سنیئے:

”میری اور زہرہ کی شادی ہوئی۔ مجھے زہرہ سے واقعی محبت تھی لیکن جب مجھے گھر والوں نے زہرہ کے ساتھ گھر سے نکال دیا تو میں سوچنے لگا کہ اب کیا ہو گا۔ کوئی ملازمت بھی نہ مل رہی تھی۔ میں نے زہرہ سے اُس کا زیور اور روپیہ لے کر جنرل سٹور کھول لیا جو چل نکلا۔ ہر عمر کی لڑکیاں اور عورتیں وہاں آتی تھیں۔ ان میں شریف بھی تھیں اور وہ بھی جو خود ہنس اور مسکرا کر بات کرتی تھیں۔ میرے دل میں زہرہ کی محبت تھی۔ یہ احساس بھی تھا کہ میں جو کچھ ہوں زہرہ کی وجہ سے ہوں لیکن زہرہ بہت بدل گئی تھی۔ جب میں صبح کا نکلا رات گئے گھر لوٹتا تو وہ مجھ سے بات بھی نہ کرتی۔ ہنسنا بولنا اُس نے چھوڑ دیا تھا۔ روٹھی روٹھی رہتی تھی۔ کچھ روز تو میں اس کو سمجھانے کی کوشش

کرتا رہا، پھر میں نے اپنی یہ کوشش ترک کر دی۔ میری دلچسپیوں کا سامان
پیدا ہو چکا تھا۔ دکان پر آنے والی دو بد قماش عورتوں سے میرے تعلقات
قائم ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ ایک جوان لڑکی عذرا بھی تھی جس کے ساتھ
میرا ہنسنا بولنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ بڑی شوخ اور زندہ دل تھی لیکن
بہت محتاط اور شریف ....

"ایک دن زہرہ نے مجھے بتایا کہ وہ ہر روز رات کو ایک خوفناک
خواب دیکھتی ہے۔ ایک سانپ آتا ہے جو اُس کے جسم پر رینگتا ہے۔ میں
نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ اُسے کہا کہ وہ خوابوں سے کیوں ڈرتی ہے، لیکن وہ
زیادہ چپ چاپ اور زیادہ چڑچڑی ہو گئی۔ میں نے بھی اس کی پرواہ کرنی
چھوڑ دی۔ میں نت نئی بازاری اور آوارہ عورتوں سے دل بہلا رہا تھا۔ عذرا
کے ساتھ میری بات چیت آگے بڑھ رہی تھی۔ عیاشیوں کی وجہ سے میں دکان
پر زیادہ دھیان نہ دے رہا تھا۔ جمع پونجی کے علاوہ دکان کی چیزیں بھی
ان آوارہ عورتوں کی نذر ہو رہی تھیں۔ میں نے ان عورتوں سے کچھ کھچنا
شروع کر دیا۔ پھر بھی میں بہکتا اور بھٹکتا رہا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا لیکن
سنبھلا نہ جاتا۔ زہرہ مجھ سے بات ہی نہ کرتی۔ اگر کرتی تو سانپ کے خواب کی
کرتی۔ میں عذرا کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا جس نے میرے ساتھ شادی کا
وعدہ کر لیا تھا، لیکن زہرہ کی موجودگی میں مَیں عذرا سے شادی نہ کر
سکتا تھا ....

"انہی دنوں میں انگریزی کا ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ میں جرم و جاسوسی اور
فحش عشق و محبت کے ناول پڑھنے کا شوقین ہوں۔ اس ناول میں مَیں نے
پڑھا کہ ایک شخص کی بیوی کو رات خواب میں سانپ دکھائی دیتا تھا۔ اس
شخص نے ایک ڈرامہ کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ بھی عیاش آدمی تھا۔ اُس کی
بیوی بڑی دولت مند تھی۔ اُس نے سوچا کہ اگر اُس کی بیوی پاگل ہو جائے
تو اُس کو اُس کی ساری جائیداد پر قبضہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اُس
نے ایک منصوبہ سوچا۔ ریشم کی ایک مضبوط ڈوری اپنے پاس رکھ لی۔ رات کو

جب اس کی بیوی سو جاتی تو وہ اس ریشم کی ڈوری کو اس کے جسم کے مختلف
حصوں پر اسی طرح حرکت دیتا کہ وہ خواب اور وہم میں یہی سمجھتی کہ اُس کے
جسم پر سانپ رینگ رہا ہے۔ یوں اُس کا خوف مستقل ہو گیا۔ ایک دن وہ
پاگل ہو گئی اور اُسے پاگل خانے بھجوا دیا گیا۔ اُس کا خاوند اُس کی ساری جائیداد
کا مالک بن گیا ....

"یہ من گھڑت کہانی تھی لیکن اس نے میرے ذہن کو شیطان کا کارخانہ
بنا دیا۔ مجھے علم تھا کہ زہرہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ میں نے اس
کے والدین کی جائیداد پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے پھر زہرہ کا خیال
رکھنا شروع کر دیا۔ اُسے علاج کے لئے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے
میرے لئے خود بخود ایک ایسی راہ کھول دی جس کا میں انتظام کر رہا تھا۔
اُس کے مشورے پر میں زہرہ کو لے کر اس کے والدین کے پاس گیا۔ اُن
کے سامنے رویا گڑگڑایا۔ انہوں نے ہمیں معاف کر کے سینے سے لگا لیا۔ ہم
چند دن وہاں رہے۔ میں نے ان پر ثابت کر دیا کہ میں بہت نیک، مؤدب
اور فرمانبردار ہوں۔ انہوں نے اپنی ساری جائیداد اور کاروبار میرے
سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ زہرہ بھی اپنے والدین سے مل کر بے حد خوش
تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں نے اس کے والدین کے سامنے گڑگڑا کر اُن کے
دل جیت لئے ہیں۔ وہ میری احسان مند تھی ....

"جب ہم واپس آنے لگے تو انہوں نے مجھے ایک معقول رقم نقد دی
جو میں نے واپس آ کر دکان میں سامان ڈالنے کی بجائے عیاشیوں میں اُڑا
دی۔ میں سمجھتا تھا کہ اب تو میں جلد ہی دولت مند ہونے والا ہوں، مگر میرا
منصوبہ پورا ہوتا نظر نہ آ رہا تھا۔ زہرہ کو سانپ والے ڈراؤنے خواب کم دکھائی
دینے لگے۔ یہ علامت میرے منصوبے کے خلاف تھی۔ میں نے اپنے منصوبے
کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کے لئے وہی حرکت شروع کر دی جو میں نے انگریزی
ناول میں پڑھی تھی۔ میں نے ریشم کی ایک ملائم ڈوری لی۔ جب زہرہ سو رہی
ہوتی تو میں اُس کے جسم پر وہ ڈوری رکھ کر اسے اِدھر اُدھر حرکت دینے لگتا۔

وہ ڈر جاتی۔ چیخ اُٹھتی۔ اُس کو خواب میں پھر سانپ نظر آنے لگا۔ کئی بار ایسا ہُوا کہ میں وہ ڈوری اس کے جسم پر پھیر رہا ہوتا کہ وہ ڈر کر جاگ جاتی۔ میں فوراً وہ ڈوری چُھپا لیتا اور اُسے بتاتا کہ میں اُسے جگانے اور حوصلہ دینے آیا تھا....

"میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جب زہرہ اپنے والدین سے ملنے جاتی ہے تو اُسے وہ ڈراؤنا خواب بہت کم نظر آتا ہے۔ اُس نے خود بھی مجھے بتایا تھا، اس لئے میں نے اپنے منصوبے کو اختتام تک پہنچانے کے لئے اس کے میکے جانے پر ایک طرح سے پابندی لگا دی تھی۔ محلّے میں مشہور کر دیا کہ میری بیوی پر جن بھوت کا سایہ ہے۔ اس پر شرِ شرار سوار ہو گیا ہے۔ محلّے کے لوگ کئی بار راتوں کو اُس کی ڈراؤنی چیخیں سُن چکے تھے۔ انہوں نے فوراً اس بات پر یقین کر لیا۔ میں نے لوٹنے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈہ کرنے والوں کی خدمات حاصل کیں تاکہ محلّے کے لوگ میرے بارے میں یہ رائے قائم کر سکیں کہ میں اپنی بیوی سے محبّت کرتا ہوں اور اس کے علاج میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ عامل آنے جانے لگے۔ ان لوگوں نے اسے بوکھلا دیا۔ وہ سچ مچ چڑچڑی ہو گئی۔ اب دن کو پھر اُسے جاگتے میں خواب دکھائی دینے لگے۔ وہ سانپ سانپ کہہ کر چیخنے لگی۔ سارا محلّہ اس کی چیخیں سُنتا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب میرا منصوبہ کامیابی سے انجام کو پہنچنے والا ہے ....

"میرا منصوبہ یہ تھا کہ زہرہ کو میں پاگل پن کی حد تک پہنچا دوں تاکہ اُسے پاگل خانے میں داخل کرانے کا جواز مل جائے۔ اس صورت میں مَیں آسانی سے عذرا کے ساتھ شادی کر سکتا تھا۔ عذرا کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں خوشحال دکاندار تھا اور جوان بھی تھا۔ مجھے زہرہ کے باپ کی جائیداد پر بھی قبضہ کرنا تھا، اور اُس سے رقم بھی بٹورنی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کے لالچ اور بدکاری نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میں زہرہ کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ اُسے خواب میں سانپ نظر آتا رہے اور وہ پاگل قرار دی جا سکے۔ ناول نے جو طریقہ بتایا تھا وہ کامیاب ثابت ہو رہا تھا....

"میری قسمت خراب تھی۔ میں نے رات کو جب دیکھا کہ زہرہ سو رہی ہے تو میں ریشم کی ڈوری لے کر اُٹھا۔ دبے قدموں قریب گیا اور حسبِ معمول اُس کے جسم کے مختلف حصّوں پر اس ڈوری کو حرکت دینے لگا۔ وہ سوتے سوتے ڈر رہی تھی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اچانک چیخ مار کر اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس وقت وہ ڈوری اُس کے گلے پر تھی۔ میں نے سمجھا کہ زہرہ کو پتہ چل گیا ہے کہ سانپ کی اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ میرے راز سے آگاہ ہو گئی ہے۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ ڈوری اُس کی شہ رگ پر تھی۔ میں نے ڈوری دونوں طرف سے پکڑ کر نیچے کو دبا دی۔ یہ شاید خوف کا اثر بھی تھا اور ڈوری سے سانس رُکنے کا بھی کہ زہ[illegible] اور اُس کے جسم کی حرکت بند ہو گئی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ مر چکی تھی۔ میں نے محلّے والوں کو جگا کر بتایا کہ میری بیوی مر گئی ہے۔ وہ بُری طرح ڈری ہوتی جاگی۔ میں اُس کی آواز پر اُٹھا۔ وہ بھی اُٹھی اور فرش پر گر پڑی۔ میں نے اُٹھایا تو پتہ چلا کہ مر گئی ہے۔ اُس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی ہے۔ محلّے والے مان گئے مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈوری گردن پر نشان پیدا کر دے گی۔"

حامد کو دس سال سزائے قید دی گئی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ سزا پُوری کر کے باہر آیا تھا یا نہیں۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا——
"دیکھ لو ایک ناول نے کس طرح ایک آدمی کو قاتل بنایا۔"

❦

پھر اُسے نیند آنے لگی

طب ونفسیات نے اس مرض کو بہت سے نام دے رکھے ہیں۔ ان میں ایک نام ANXIETY NEUROSIS ہے۔ یہ مرض اُن لوگوں کو لاحق ہوتا ہے جو اپنے اُوپر ہیجان طاری کئے رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ حالات یا انسان انہیں کرنے نہیں دیتے۔ یہ مرض اکثر مخلص اور دیانتدار لوگوں کو لاحق ہوتا ہے۔

ڈاکٹر بھٹی صاحب نے اس مرض کو اتنا زیادہ بیان کیا کہ یہ میری سمجھ سے اُونچا چلا گیا۔ انہوں نے کہا کہ بیماریوں کے نام تو رکھ دیئے گئے ہیں، ان کی تشخیص بھی کر لی جاتی ہے مگر اصل مسئلہ علاج کا ہے۔ نفسیاتی امراض میں یہ خرابی ہے کہ جسمانی بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جسمانی علامات کا علاج کرتے رہتے ہیں مگر افاقہ نہیں ہوتا۔ حالات اور انسانوں کے پیدا کردہ امراض کا صحیح علاج تو یہ ہوتا ہے کہ حالات اور انسان مریض کے مطابق بدل جائیں یا مریض اُن کے ساتھ سمجھوتہ کر لے۔

زبیر احمد میرا ایسا ہی مریض تھا۔ بڑے اچھے سرکاری عہدے کا آدمی تھا۔ (زبیر احمد اُس کا اصل نام نہیں) وہ کم و بیش پینتالیس برس کی عمر میں میرے پاس آیا۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی تھی۔ بیوی کی بجائے بیگم کہوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اُس کی چال ڈھال، لباس، بالوں کی تراش، میک اپ اور بولنے کا انداز بیگموں جیسا تھا۔ بیگم سے میری مراد ہے فیشن میں ڈوبی ہوئی عورت جس نے قدرتی پن پر تصنع کا ملمع چڑھا رکھا ہو۔ مریض تو زبیر لگتا تھا لیکن مرض اُس کی بیگم نے بیان کیا۔

"ڈاکٹر صاحب!"۔ بیگم نے کہا۔ "ان کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی ہے۔ رات کو سوتے بھی نہیں۔ بھوک بھی کم ہو گئی ہے۔ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں اور کبھی ایسے لگتا ہے جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہے اور یہ خیالوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ دفتر میں ان کا رویّہ معلوم نہیں کیسا ہوتا ہے۔ گھر میں ہوتے ہیں تو بیٹھے بیٹھے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ باہر نکلتے اور پھر واپس آجاتے ہیں"

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ شخص ہیجانی نیوراسس کا مریض ہے اور اس کی وجہ یہی بیگم ہو گی۔ باتونی انسان اپنے پردے جلدی اُٹھا دیا کرتا ہے۔ بناوٹی باتیں کرنے والے کے متعلق بڑی جلدی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ انسان اندر سے کھوکھلا ہے، یا اُس نے اپنے اُوپر خول چڑھا رکھا ہے۔ یہ عورت ایسی ہی کھوکھلی تھی لیکن میری رائے یہ تھی کہ یہ عورت گہری بھی ہے اور مُخلص نہیں۔

میں نے مرض کی مزید علامات پُوچھیں تو مجھے جسمانی علامات ہی بتائی گیئں۔ میں نے زبیر سے پوچھا کہ اُس کے ذہن میں عام طور پر کیا خیال اٹکا رہتا ہے اور اُس کے ذہن میں کیا کیا سوچیں آتی ہیں۔

زبیر کی بجائے اُس کی بیگم نے جواب دیا۔ "انہیں کیا غم ہو سکتا ہے جی! ہر طرح اللہ کا فضل ہے"۔ اُس نے اپنے خاوند کا عہدہ یوں بتایا جیسے وہ صدرِ مملکت ہو۔ بہر حال ہُوا یہ کہ زبیر کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ رہی اور اُس کی بیگم بولتی رہی۔

"آپ کی اولاد کتنی ہے؟"۔ میں نے پُوچھا۔

"صرف ایک بیٹی ہے"۔ بیگم نے جواب دیا۔

میں تو ڈاکٹر ہوں، کوئی معمولی سی عقل اور فہم کا آدمی ہوتا تو وہ بھی سمجھ جاتا کہ زبیر احمد کے اعصاب پر بیگم سوار ہے۔ مجھے چونکہ جسمانی علامات بتائی گئی تھیں اس لئے میں نے دوائیاں لکھ دیں جن میں ذہن کو سکون اور نیند دینے والی گولیاں بھی تھیں۔ یہ نُسخہ دے کر میرے دل پر ایسا بوجھ پڑا جیسے میں نے گناہ کیا ہو۔ آج کل ڈاکٹروں کے ہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔

مرض کا باعث کچھ اور ہوتا ہے اور دوائیاں جسمانی علامات کے مطابق دی جاتی ہیں۔

میں جان چکا تھا کہ زبیر کو یہ مرض حالات اور اِس بیگم کی وجہ سے لاحق ہُوا ہے، اور میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ زبیر کا چہرہ جو پیلا پڑا ہُوا اور اُس کی آنکھوں میں جو بے چینی سی ہے یہ مرض کی شدّت کا ثبوت ہے۔ اُس کی مُسکراہٹ خوشی یا اطمینان والی مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ جب اپنی بیگم کی طرف دیکھتا تھا تو اس میں پسندیدگی والا انداز نظر نہیں آتا تھا۔ وہ دونوں جانے لگے تو بیگم پہلے باہر نکلی۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے زبیر سے کہا کہ وہ کسی وقت اکیلا میرے پاس آئے۔

دوسرے ہی دن وہ آگیا۔ کہنے لگا کہ دفتر سے آرہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں صرف کاروبار کی خاطر پریکٹس نہیں کر رہا۔ بچّے جوان ہو کر کمانے لگے ہیں۔ میں اب اس عمر میں دولت سمیٹ کر کیا کروں گا۔ میں اب چاہتا ہوں کہ میرے پاس مریض کم آئیں اور میں ان کا نفسیاتی پوسٹمارٹم کر کے علاج کروں۔ اُسے کہا کہ وہ مجھے بے تکلفی سے بتائے کہ وہ کیا سوچ ہے جو اُسے سونے نہیں دیتی اور اُس کی بھوک بھی ماری گئی ہے؟

اُس نے مجھے کہا کہ میں اُس کی بیگم کو پتہ نہ چلنے دوں کہ اُس نے میرے ساتھ ملاقات کی اور یہ سب کچھ بتایا ہے۔ وہ پُرانے زمانے کا گریجویٹ تھا جب تعلیم صحیح معنوں میں تعلیم ہوتی تھی۔ اُس میں دانشمندی بھی تھی۔ اُس کے ساتھ باتیں کرتے مجھے لُطف سا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی زندگی کی کہانی سُنائی جو میں آپ کو اُسی کی زبانی سُناتا ہوں۔ صرف ضروری حصّے سناؤں گا؛

"اُدھر مجھے ایم۔ اے کی ڈگری ملی اِدھر والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ دو بہنیں مجھ سے چھوٹی تھیں اور والدہ صاحبہ بھی تھیں۔ والد صاحب کی وفات نے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ایم۔ اے کر چکا تھا۔ والد صاحب کے ایک سِکھ اور ایک مسلمان دوست

نے مجھے بڑی اچھی نوکری دلا دی۔ میں نے والدہ سے کہا کہ بہنوں کو تعلیم
دلا کر اور اُن کی شادیاں کر کے خود شادی کروں گا۔ آپ کو وہ زمانہ یاد ہو
گا۔ مہنگائی کا یہ عالم نہ تھا۔ پُرسکون زمانہ تھا۔ والد صاحب نے ہمیں ہمیشہ
راہِ راست پر چلنے کے سبق دیتے تھے۔ میں اللہ کی اس راہ پر قائم رہا....

"والدہ کا دل ٹھکانے نہیں رہتا تھا۔ والد صاحب کی وفات نے اُن
پر بڑا ہی گہرا اثر کیا تھا۔ والدہ کہنے لگیں کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ حج
کر لوں تو رُوح کو تسکین ہو جائے گی۔ میں اس قابل نہیں تھا لیکن میں نے
والدہ کو حج کرا دیا مگر حج سے واپس آکر والدہ ایسی بیمار پڑیں کہ اللہ کو
پیاری ہو گئیں۔ میں نے اپنی زندگی اپنی بہنوں کے لئے وقف کر دی۔ میں
ایسے محکمے میں تھا کہ اللہ کے فضل' سے میں ہاتھ رنگ سکتا تھا مگر میں
نے والد صاحب کی دکھائی ہوئی اللہ کی راہ کو نہ چھوڑا۔ میرا عہد تھا کہ بہنوں
کو حلال کی کمائی سے بیاہوں گا....

"اللہ نے میرا عہد پورا کر دیا۔ میں نے دونوں بہنوں کی شادی بڑے
اچھے خاندانوں میں کر دی مگر ڈاکٹر صاحب! میں نے حرام نہیں کھایا تھا۔
کوئی ایسا گناہ بھی نہیں کیا تھا پھر بھی خُدا نے میری زندگی تلخیوں اور
آزمائشوں سے بھر دی۔ میرا ایثار دیکھیں کہ میں نے بہنوں کو بیاہ کر خود
شادی کرنے کا جب عہد کیا تو اُس وقت میری عمر چونتیس سال ہو چکی تھی۔
بہنیں مجھے رو رو کر کہا کرتی تھیں کہ میں شادی کر لوں لیکن میں ہنس ہنس
کر انہیں کہا کرتا تھا کہ تمہارا فرض ادا کر کے شادی کروں گا....

"اب دونوں بہنوں نے میرے لئے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا مگر
میری جوانی جو بالکل بے داغ تھی، لڑکیوں والے کہتے تھے کہ ڈھل گئی ہے۔
یعنی میں اب جوان لڑکی کے قابل نہیں رہا تھا۔ آخر ایک بیوہ کا رشتہ ملا جس
کی عمر تیس سے ایک دو سال اُوپر تھی۔ اُس کی ایک بیٹی پہلے خاوند
سے تھی۔"

میں نے زبیر سے پُوچھا کہ وہ یہی بیٹی تو نہیں؟

"یہی ہے" — اُس نے کہا — "یہ بیٹی میری نہیں، میری بیوی کی

ہے لیکن میں اسے اپنی بیٹی کہا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بیوہ اس وجہ سے پسند
آئی کہ غریب سے ایک سکول ٹیچر کی بیٹی تھی جو متوسط طبقے سے ایک آدھ درجہ
نیچے کا آدمی تھا۔ مجھے امیر ماں باپ کی بیٹی اور جہیز کی خواہش نہیں تھی خوبصورت
بھی تھی۔ اس کی دو شرطیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ جہیز کے بغیر آئے گی اور دوسری
یہ کہ اُس کا ہونے والا خاوند اُس کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھے۔ میں نے تہہ دل
سے دونوں شرطیں قبول کر لیں اور نہایت خاموشی اور سادگی سے
ہماری شادی ہو گئی....

"اُس وقت اس بچّی کی عمر گیارہ سال تھی۔ غریب گھرانے کی بیٹی
ہونے کی وجہ سے ماں بیٹی میں سادگی تھی۔ یہی مجھے اچھی لگتی تھی۔ شادی
کے ساتھ ہی برصغیر میں انقلاب آیا اور پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ میرے
محکمے کے ہندو اور سکھ اُدھر چلے گئے۔ جگہیں پُر کرنے کے لئے ترقیاں کھل
گئیں۔ مجھے افسری کا عہدہ مل گیا اور محکمہ وہی تھا جہاں چاندی کی گنگا بہتی
تھی لیکن میرا کردار اب پوری طرح پختہ ہو چکا تھا۔ لالچ کی تو کوئی حد ہی نہیں۔
دولت جتنی آجاتے کم سمجھی جاتی ہے لیکن مجھے جو خدا نے دیا تھا اسے میں
بہت سمجھتا تھا۔ مکان اپنا تھا۔ ایک مکان اور دو دکانیں کرائے پر چڑھی
ہوئی تھیں۔ تنخواہ بھی اچھی تھی یعنی معقول سے خاصی زیادہ تھی....

"میں نے اپنی بیوی کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا لیا اور وہ میرے پیار کو
قبول کرنے لگی۔ بیوی میری توقعات سے بڑھ کر اچھی ثابت ہوئی۔ میرے
لئے اب سکون اور اطمینان تھا۔ ڈاکٹر صاحب! انسان جہاں سکون حاصل
کرنا چاہے اُسے مل سکتا ہے۔ دل لگانے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا تھا
کہ خُدا نے مجھے بہت بڑا انعام دیا ہے مگر یہ سکون اور اطمینان عارضی ثابت
ہُوئے۔ میں چونکہ اپنے محکمے کے اس شعبے کا افسر تھا اس لئے میرے
سٹاف کے بعض آدمیوں کی بیویاں میری بیوی کے پاس آتی تھیں اور
بیوی مجھے بتایا کرتی تھی کہ آج ہیڈ کلرک کی بیوی آئی تھی، آج سپرنٹنڈنٹ
کی بیوی آئی تھی، آج فلاں ٹھیکیدار کی بیوی آئی تھی....

"ان بیویوں نے میری بیوی کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ میری بیوی کی خوشامد کیا کرتی تھیں۔ میری بیوی غریب گھرانے میں جنی پلی تھی۔ اُس کا مرحوم خاوند بھی معمولی سا دکاندار تھا۔ میں نے اُسے امیری اور افسری کے احساسِ برتری سے پاک رکھا تھا مگر خوشامدیوں کی بیویوں نے اُسے 'افسر کی بیوی' اور پھر بیگم صاحبہ بنا دیا۔ انہی عورتوں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں چاہوں تو نوٹوں کی گٹھیاں ہر روز گھر لا سکتا ہوں۔ ان عورتوں نے اُسے بڑے قیمتی تحفے بھی دیئے تھے....

"ایک روز میری بیوی نے مجھے کہا کہ ہر محکمے میں رشوت لی جاتی ہے تو میں کیوں نہیں لیتا۔ میں نے پیار اور خلوص سے اُسے سمجھایا کہ رشوت کتنی بُری لعنت ہے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اُسے میری بات اچھی نہیں لگی۔ ایک شام میں گھر آیا تو میری بیوی نے پانچ ہزار روپیہ میرے آگے رکھ کر کہا کہ یہ فلاں ٹھیکیدار کی بیوی دے گئی ہے۔ کہتی تھی کہ اس کے خاوند کا دو لاکھ سے کچھ اُوپر کا بِل رُکا ہُوا ہے۔ میں نے بیوی کو بتایا کہ اُس کا بِل اُس وقت تک رُکا رہے گا جب تک وہ بِل کی رقم ایک لاکھ تین ہزار نہیں کرتا۔ وہ گورنمنٹ سے پُورا ایک لاکھ فالتو لینا چاہتا ہے۔ میں نے بیوی سے کہا کہ یہ رقم ابھی اُس کے گھر لوٹا آؤ یا میں کل ٹھیکیدار کو واپس کر دوں گا....

"بیوی نے ناک چڑھالی۔ اس بات پر میری اور اُس کی پہلی تُرش کلامی ہوئی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں نے اپنی بہنوں کا جہیز حلال کی کمائی سے بنایا تھا۔ تمہاری بیٹی کا بھی جہیز حلال کی کمائی سے بناؤں گا۔ اگر تم نے اس میں حرام کا ایک پیسہ بھی شامل کیا تو تمہاری بیٹی اُجڑ جائے گی مگر میری بات اُس کے پلّے نہ پڑی۔ میں نے ایک ہزار روپیہ اپنے پاس سے دے کر کہا کہ یہ لو اور جہاں جی چاہے خرچ کرو۔ اُس نے یہ ایک ہزار بھی رکھ لیا اور پانچ ہزار بھی رکھ لیا۔ کہنے لگی کہ واپس کر دے گی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اُس نے یہ رقم واپس نہیں کی تھی....

"تفصیلات بڑی لمبی ہیں ڈاکٹر صاحب! وہ مجھے رشوت لینے پر اُکساتی رہتی تھی اور اس پر ہماری تُو تُو مَیں مَیں رہتی تھی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ ہمارا کوئی بچہ نہ ہُوا۔ میں نے اپنا معائنہ کرایا۔ بیوی کا بھی کرایا۔ پتہ چلا کہ اُس میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیّت نہیں ہے۔ اس بچّی کی پیدائش کے بعد یہ نقص پیدا ہُوا تھا۔ اولاد جیسی نعمت سے محروم ہو کر بھی میں نے اپنے دل میں اس عورت کے پیار کو تر و تازہ رکھا مگر اُس کا دماغ پھر چُکا تھا۔ میں اُس کی بیٹی کو اپنی بہنوں کی طرح پردہ دار لڑکی بنانا چاہتا تھا مگر بچّی نے آٹھویں جماعت پاس کی تو میری بیوی نے مجھے پُوچھے بغیر اُس کے بال نئے فیشن کے مطابق کٹوا دیئے۔ میں نے بہت شور شرابا کیا جس کے جواب میں بیوی نے مجھے پسماندہ اور دقیانوسی مولوی کہہ ڈالا....

"اُس نے اپنا حلیہ بھی بدل ڈالا۔ شوخ لباس پہننے لگی اور میک اَپ شروع کر دیا اور مجھے طنزیہ لہجے میں کہنے لگی کہ آپ کو اپنی حیثیت کا کوئی احساس نہیں، مجھے تو ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیٹی بھی مجھ سے کھچی کھچی رہنے لگی۔ میں شروع سے خاموش طبع انسان ہوں، اپنی بیوی کا روّیہ دیکھ کر میرے ہونٹ سل گئے۔ میں اُس کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھ کر کبھی ڈانٹ کر کہتا کہ وہ شریف باپ کی بیٹی بنے تو اُس کی ماں رونے لگ جاتی اور کہتی 'یتیم بچیّوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہُوا کرتا ہے۔ اس کا باپ زندہ ہوتا تو....' وہ دیکھ رہی تھی کہ میں اُس کی بیٹی سے کتنا پیار کرتا ہوں لیکن اُس نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا....

"ایک بار تو میرے گھر میں اتنا ہنگامہ ہُوا کہ محلّے کی کئی عورتیں آ گئیں۔ میری بیوی نے واویلا بپا کر دیا کہ میں اُس کی بیٹی کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا ہوں۔ اس مقام پر آ کر میری نیند اور بھُوک کم ہونے لگی۔ گھر کے سارے پیسے میری بیوی کے پاس ہوتے تھے لیکن وہ جس طرح شاہ خرچ ہو گئی اس سے مجھے خیال آتا تھا کہ تنخواہ اور کرائے سے تو اتنی عیاشی نہیں کی جا سکتی۔ دراصل ڈاکٹر صاحب! غریب گھرانے میں پیدا اور جوان ہونے والی عورت

لے جو محرومیاں دیکھی تھیں وہ برتری کے مرض کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔
وہ بناوٹی بیگم بن گئی اور میں شرافت اور عزّت کی خاطر ذہنی مریض ہوتا گیا۔
یہ عورت اپنی بیٹی کے ساتھ میرے دماغ پر سوار ہو گئی ....

"لڑکی دسویں جماعت کے آخری دنوں میں تھی جب میں نے اُسے
ایک لڑکے کے ساتھ سینما ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ میرا دماغ چکرا گیا۔
وہ دوسرے شو کا وقت تھا۔ میں نے گھر آکر اپنی بیوی کو بتایا۔ کیا ڈاکٹر
صاحب، آپ تسلیم کریں گے کہ بیوی نے مجھے یہ جواب دیا ہو گا؟ اُس
نے کہا — 'میں تو آپ کی قیدی ہوں کیونکہ میرا آپ کے ساتھ نکاح پڑھا
گیا ہے۔ میری بیٹی کو آپ اپنا قیدی بنانے کا خیال چھوڑ دیں' — میں اپنے
کمرے میں چلا گیا اور میرے آنسو نکل آئے۔ لڑکی رات دس بجے آئی میں
نے اُس سے پوچھا کہ کہاں سے آرہی ہو۔ اُس نے جھوٹ بولا کہ فلاں سہیلی کے
گھر چلی گئی تھی۔ میں نے کہا کہ تم سینما ہال میں تھیں تو اُس نے رونا شروع کر دیا
اور اُس کی ماں نے اُسے سینے سے لگا کر کہا — 'نہ رو بیٹی! تیرا باپ زندہ
ہوتا تو تجھ پر یہ الزام نہ لگتا' ....

"میں نے انگارے نگل لئے اور میں اس مرض کا مریض ہو گیا جس
کے علاج کے لئے میں آپ کے پاس کل آیا تھا۔ میری بیوی مکمل بیگم بن چکی
تھی۔ کئی کئی دن ہماری آپس میں بول چال بھی نہیں ہوتی تھی۔ میری فطری
کمزوریاں جن میں شرافت بنیادی حیثیت رکھتی تھی، مجھے اُس کے خلاف
کچھ کرنے نہیں دیتی تھیں اور اُس کی کمزوریاں اور اوائل عمر کی محرومیاں
اُس کی عقل پر قبضہ کر چکی تھیں۔ پاکستان کی سوسائٹی اس مقام پر جا پہنچی تھی
جہاں سے امریکی اور یورپی تہذیب بلکہ فیشن شروع ہوتا ہے۔ ایسا ہونا ہی
تھا۔ ایسے ایسے لوگ افسر بن گئے تھے جو اَپر ڈویژن کلرکی کے ہی قابل
تھے۔ رشوت کی دولت نے رشوت خوروں کے دماغ ماؤف کر دیئے تھے۔
یہ سب لوگ اُردو یا اپنی مادری زبان میں بات کرنے میں اپنی توہین سمجھتے
تھے۔ افسر لوگ اُن انگریزوں کی طرح باتیں اور حرکتیں کرتے جن کے وہ ماتحت

رہ چکے تھے۔ اپنے تہذیب و تمدّن اور دین ایمان سے لوگ منحرف ہوتے
جا رہے تھے۔ عورتیں فیشن میں ڈوب کر کارٹون بن گئی تھیں۔ پارٹیاں، ڈنر
اور کلب زندگی کا لازمی حصّہ بن گئے تھے ....

"میری بیوی مجھے اِس سوسائٹی میں لے جانا چاہتی تھی۔ اُسے میرے
ساتھ صرف یہ دلچسپی تھی کہ میں افسر تھا۔ وہ میرے کندھے پر سوار ہو کر سوسائٹی
میں بیگم بن کر اپنی نمائش کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے گھر میں جدید قسم کا فرنیچر
رکھ لیا۔ اس حد تک تو مجھے خوشی ہوتی تھی کہ اُس نے گھر بنا دیا ہے مگر اُس
کی نیّت مجھے بہت پریشان کرتی تھی۔ وہ میرے گھر میں پارٹیاں کرنا چاہتی تھی،
یہ مجھے پسند نہیں تھا۔ اگر میں اس راہ پر چل پڑتا تو میرے لئے رشوت خوری
ضروری ہو جاتی۔ بیوی نے اپنی بیٹی کو ماڈرن بنا دیا اور میرے خلاف کر دیا
تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں ماں بیٹی کو خرچ دینا بند کر دیتا اور پیسے
اپنے ہاتھ میں رکھتا۔ بیٹی گھر میں اپنی سہیلیوں کی دعوتیں کرنے لگی ....

"میں مریض بنتا چلا گیا۔ بعض راتیں ایسی آئیں کہ میں ایک منٹ کے
لئے بھی نہ سو سکا۔ میری بھوک بالکل ختم ہو گئی اور میں بے چین رہنے لگا
میں دو ڈاکٹروں کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے خواب آور گولیاں دیں لیکن
ان کا اثر ہٹنے کے بعد میری حالت بہت بُری ہو جاتی۔ ایک اور ڈاکٹر صاحب
میرے دوست ہیں۔ وہ ملک سے باہر گئے ہوتے تھے، واپس آتے تو
انہیں اپنی حالت اور ڈاکٹری نسخے دکھاتے۔ انہوں نے یہ گولیاں کھانے
سے سختی سے منع کر دیا اور پوچھا کہ مجھے کیا غم ہے۔ وہ میرے دوست
ہیں اس لئے انہیں اپنے گھریلو حالات بتا دیئے۔ انہوں نے کہا کہ
حالات پر قابو پانے کی کوشش کرو اور یہ دوائیاں نہ لو ورنہ دماغی
صلاحیتوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس بیوی کو
طلاق دو اور دوسری شادی کرو تاکہ تمہارے بچے ہوں۔ تمہیں بچوں
کی ضرورت ہے ....

"اگر میں اتنا دلیر ہوتا تو کبھی کا رشوت خور بن چکا ہوتا۔ بیوی کو طلاق

دینے کی مجھ میں جرأت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اب عمر بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ آپ اسے میرے کردار کی بلندی کہہ لیں یا بزدلی کہہ لیں کہ میں نے نہ بیوی کو لگام ڈالی نہ اُس کی بیٹی کو اس راستے سے ہٹا سکا اور طلاق کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا....

"اب ماں بیٹی میرے لئے سیلاب بن گئیں جس کے آگے کوئی آدمی قدم نہیں جما سکتا۔ بیٹی کالج میں چلی گئی اور یورپی شہزادی بن گئی۔ مجھے پتہ چلا کہ میری بیوی نے مجھ سے پوچھے بغیر کرائے پر چڑھے ہوئے مکان اور دکانوں کا کرایہ بڑھا دیا ہے۔ کرایہ وہی وصول کیا کرتی تھی۔ ایک دکاندار نے کرایہ نہ بڑھایا تو میری بیوی نے اُسے میری افسری کا رُعب دکھا کر دکان خالی کرالی اور تین ہزار روپیہ پگڑی لے کر دکان کسی اور کو کرائے پر دے دی۔ یہ حرکت میری برداشت سے باہر تھی۔ میں نے بیوی سے باز پُرس کی تو اُس نے میرے ساتھ اس طرح بات کی جیسے میں بھی اُس کا کرایہ دار ہُوں ....

"میں نے اُسے اور سب کچھ کہنے کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم اپنی بیٹی کا جہیز بھی بنا رہی ہو۔ یاد رکھو کہ تم نے بیٹی کے جہیز میں حرام کا ایک بھی پیسہ شامل کیا تو اس کی سزا تمہاری بیٹی کو ملے گی مگر وہ مجھے پسماندہ اور دقیانوس کہتی رہی۔ اس کے بعد میرے گھر کے حالات جہنم جیسے ہوگئے۔ میری بیوی نے اپنی جنت آباد کر لی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اُس کی بیٹی کو دو لڑکوں کے ساتھ دیکھا۔ اُن کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ میں نے اُس کی ماں سے کچھ نہ کہا۔ کہتا تو بے عزّتی میری ہی ہوتی....

"اور ایک روز میری بیوی نے مجھے بتایا کہ اُس نے اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر لیا ہے اور ایک مہینے تک شادی ہو جائے گی۔ لڑکا اور خاندان بہت اچھا ہے۔ اُس نے مجھے جہیز اور شادی کے دیگر لوازمات کی فہرست دکھائی۔ اُس نے بہت سا جہیز خود ہی بنا لیا تھا۔ میں اُس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ وہ اتنے پیسے کہاں سے لائی تھی۔ اُسے میرے مشورے کی ضرورت ہی نہیں

تھی۔ وہ تو مجھے اطلاع اور حکم دے رہی تھی۔ اپنے کردار کے مطابق مجھے اُس کی بیٹی کے مستقبل کے ساتھ دلچسپی تھی۔ میں نے بیوی سے پُوچھا کہ اُس نے لڑکے کے خاندان کے متعلق کسی سے کچھ معلوم کر لیا ہے اور لڑکے کا چال چلن کیسا ہے؟ ....

"اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا کہ ہم سے بہتر ہے۔ اُس نے مجھے اُن لوگوں کا اَتا پتہ بتا دیا۔ میرے اپنے ذرائع تھے۔ میں نے پتہ کرایا تو مجھے بتایا گیا کہ لڑکا ماں باپ کا اکلوتہ ہے۔ کسی کام اور کاروبار میں نہیں ٹکتا۔ آوارہ لڑکا ہے اور ماں باپ نے اُسے شہزادہ بنا رکھا ہے۔ یہ رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے بات کی تو اُس نے کہا کہ میں اپنی بیٹی کسی مولوی کے گھر میں نہیں دے سکتی۔ ہمارا جو سٹینڈرڈ ہے میں نے اُس کے مطابق لڑکا اور خاندان دیکھا ہے۔ میری زبان بالکل ہی بند ہوگئی....

"شادی میں میری حیثیت ایک باراتی جیسی تھی۔ میں نے دیکھا کہ شادی کے انتظامات کرنے والے میرے سٹاف کے چند ایک آدمی تھے اور تین آدمی ایسے تھے جن کے کام میرے شعبے سے تعلق رکھتے تھے مثلاً ٹھیکیدار وغیرہ۔ یہ سب لوگ مجھے شادی کے دوران فرشی سلام کرتے تھے۔ میرا سلوک ان کے ساتھ افسروں والا نہیں ہوتا تھا۔ میں باہر کے کسی آدمی کا کام رُکنے نہیں دیتا تھا، لیکن ان لوگوں کو شادی کے انتظامات کرتے دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہُوا۔ میں اِسے بھی رشوت سمجھتا تھا....

"مختصر بات اس طرح ہے کہ میری بیوی کی بیٹی کی شادی بڑی شان سے ہوئی۔ بیٹی چلی گئی۔ میں اور بیوی رہ گئے۔ اب اُس نے میرے ساتھ رویّہ بدل لیا۔ میرے ساتھ باتیں بھی کرنے لگی۔ میرا حال احوال بھی پوچھنے لگی اور اُسے پہلی بار پتہ چلا کہ مجھے رات نیند نہیں آتی اور بھُوک بھی نہیں لگتی اور میں اعصابی زدگی کا مریض ہوتا جا رہا ہوں۔ میں اتنا سیدھا آدمی ہوں کہ اُس کے اتنے سے ہی بدلے ہوئے رویّے سے میں نے اُس کی سب غلطیاں اور بدتمیزیاں معاف کر دیں۔ انسان کی نیّت

صاف ہوتو مصالحت کی صورت نکل ہی آتی ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ ہر ماں اپنی بیٹی کو کہیں آباد کرنے کے لئے پریشان رہتی ہے۔ یہی حال میری بیوی کا تھا۔ یہ اپنی بیٹی کو اچھے خاندان میں بیاہنے کے لئے اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتی رہی ہے، مگر بات کچھ اور ہی نکلی۔ اُس کا انتخاب اُس کے لئے وبالِ جان بن گیا ....

"ایک ہی مہینہ بعد لڑکی ہمارے پاس آئی۔ وہ خوش نہیں تھی۔ میں نے سگے باپ کی طرح اُس سے پُوچھا تو اُس نے مجھے کچھ نہ بتایا۔ دوسرے دن اُس کی ماں نے مجھ سے ایک ہزار روپیہ مانگا۔ میں نے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس کی بیٹی کو ضرورت ہے۔ میں نے بیٹی کے نام پر اُسے ایک ہزار روپیہ دے دیا۔ بیٹی چلی گئی۔ ایک مہینہ اور گزرا تو بیٹی پھر آئی۔ میں نے ماں بیٹی کو خاصا پریشان دیکھا۔ اب انہوں نے مجھ سے تو کچھ نہ مانگا بیٹی اُسی روز چلی گئی۔ مجھے شک ہُوا کہ وہ کچھ پیسے لے کر گئی ہے ....

"میں نے جب اپنی بیوی کو زیادہ پریشان دیکھا تو ایک رات میں نے اُسے کہا — 'معلوم ہوتا ہے تمہاری بے راہ روی نے تمہیں سزا دینی شروع کر دی ہے۔ جو کچھ بھی ہے مجھے بتا دو۔ شاید میں کچھ مدد کر سکوں' — اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے مجھے بتا دیا۔ کہنے لگی کہ اُس کا داماد بہت ہی آوارہ ثابت ہُوا ہے۔ آئے دن اُس کی بیٹی سے کہتا ہے کہ اپنی ماں سے کچھ پیسے لا دو۔ پہلے بیٹی ایک ہزار روپیہ لے گئی پھر آٹھ سَو لے گئی۔ اِس دوران سَو سَو روپیہ تین دفعہ لے گئی۔ اب اُسے کہتا تھا کہ اپنا زیور بیچ دو، ایک کاروبار شروع کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بیٹی نے میری بیوی کو بتایا کہ لڑکا دوسری لڑکیوں کے ساتھ شامیں گزارتا ہے اور اُسے بھی ساتھ لے جاتا اور اپنے دوستوں میں بٹھا دیتا ہے اور یہ سب بڑی بے ہودہ باتیں کرتے ہیں ....

"یہ تھا مغرب کے کلچر کا اثر جو ہماری نوجوان نسل نے قبول کر لیا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ میں لڑکے کے باپ سے بات کروں گا اور اگر

لڑکا نہ سُدھرا تو میں طلاق لے لُوں گا۔ لڑکی ابھی جوان ہے، بوڑھی تو نہیں ہو گئی، مگر میری بیوی طلاق کے نام سے گھبرا گئی۔ وہ آخر ماں تھی، مجھے کہنے لگی کہ میں ان لوگوں کے ساتھ ایسی بات نہ کروں ورنہ طلاق کی صورت میں بیٹی داغدار ہو جائے گی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ فکر نہ کرے میں اُس کی پوری مدد کروں گا اور اگر مجھے جائیداد بیچنی پڑی تو بیچ کر اُس کی بیٹی کی ازدواجی زندگی خوشیوں سے بھر دوں گا ....

"میری بیوی اتنی پریشان تھی کہ سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔ میں نے سہارا دیا تو میری ہو کے رہ گئی لیکن اُس کا بیگم پن، میک اپ اور نمائش پسندی نہ گئی۔ میں نے اُسے اس سے نہ روکا۔ یہ آج کل کی بات ہے۔ اُس نے مجھ میں اتنی دلچسپی لی کہ آپ کے متعلق کسی نے اُسے بتایا تو وہ مجھے آپ کے پاس لے آئی۔ میں جانتا ہوں کہ میرا علاج آپ کے پاس نہیں۔ یہ گولیاں مجھے کوئی سہارا نہیں دے سکتیں۔ میری بیوی جب پریشان نہیں تھی تو مجھے اور قسم کی پریشانی تھی جو آپ کو بتا چکا ہوں، اب وہ پریشان ہے تو مجھے اور قسم کی پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ اِس میں اضافہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک بیگم بنی ہوئی ہے اور اُس کے دماغ سے رشوت نہیں نکلی۔ میں آپ کو ایک بات اور بھی بتا دوں۔ تھوڑے ہی دن ہوتے مجھے پتہ چلا ہے کہ میری بیوی میرے نام پر رشوت لیتی ہے۔ میں نے بیوی سے پُوچھا نہیں۔ جب بھی پوچھوں گا وہ لڑائی جھگڑا شروع کر دے گی۔ اب تو وہ پہلے سے زیادہ غصّے سے بھری ہوتی ہے کیونکہ اس پر بیٹی کا دُکھ بھی سوار ہے۔ اب بتایئے، آپ کی دوائیاں مجھے کیا فائدہ دے سکتی ہیں؟"

میں اُسے مایوس کرنا بہتر نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ اُس کا علاج حالات کی بہتری میں ہے دوائیوں میں نہیں۔ میں نے لیکچر سا دے ڈالا اور اس کے اعصاب کی تقویت کے لئے انجکشن لکھ دیئے اور اُسے کہا کہ وہ ذہنی سکون کے لئے کوئی نہ کوئی دوائی ضرور لے تاکہ اُس پر حالات کا زیادہ اثر نہ ہو۔

وہ چلا گیا لیکن میرے دل پر بوجھ چھوڑ گیا۔ ہمارے معاشرے میں اس قسم کے مریضوں کی کمی نہیں۔ وہ حالات اور انسانوں کی بے رحمی کا شکار ہیں اور طرح طرح کی جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ انہیں جو دوائیاں دی جاتی ہیں اُن کا فائدہ ڈاکٹر کو ملتا ہے یا دوا فروشوں کو۔ مریض دوائیاں کھاتا اور صحت یابی کی اُمید پہ زندگی گزارتا چلا جاتا ہے۔

زبیر پھر میرے پاس نہ آیا۔ وہ عقل والا تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ دوائیوں کا سہارا جھوٹا ہے۔ وہ تقریباً چار مہینوں بعد آیا۔ میں نے اُس کے چہرے پہ تندرست انسانوں والی رونق اور مسکراہٹ دیکھی۔ حالات نے پلٹا کھا کر اُس کا علاج کر دیا تھا لیکن یہ پلٹا ہمارے معاشرے کا ایک اور حادثہ تھا جس کی وجہ مغرب کی اندھی تقلید اور اپنے تہذیب و تمدّن سے انحراف ہے۔ زبیر نے بتایا —"میری بیوی کی بیٹی دوسری مرتبہ آٹھ سَو روپیہ لے کر گئی تو ایک مہینے سے پہلے پہلے پھر آگئی۔ اب اُس کے خاوند نے اُسے کہا تھا دس ہزار روپیہ لاؤ ورنہ وہ اُسے طلاق دے دے گا۔ میری بیوی نے مجھے بتایا اور کہا کہ ایک دکان بیچ کر اُسے دس ہزار روپیہ دے دیتے ہیں اور کہیں گے کہ آئندہ اُسے کچھ نہیں ملے گا ....

"میں نے اُسے کہا کہ اگر اُسے اتنی زیادہ رقم مل گئی تو وہ ایک دو مہینوں میں اُڑا کر مزید رقم کا مطالبہ کرے گا۔ میں ابھی اُس کے ساتھ فیصلہ کر دوں گا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ لڑکی نے میرا ساتھ دیا۔ پہلے تو وہ رو رہی تھی۔ اچانک تیز ہو گئی۔ کہنے لگی —'اُسے ایک پیسہ نہیں دیں گے۔ مجھے اس شخص سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ مجھے اپنی بیوی سمجھتا ہی نہیں۔ میں جاتی ہوں۔ دیکھوں گی وہ کیا کرے گا'— اور وہ بڑی جرأت سے چلی گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اپنے داماد کے پاس نہ جائے۔ وہ سر چڑھ گیا ہے۔ میں اُس پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔ میری بیوی مان گئی ....

"آٹھ دس دن گزر گئے۔ ایک روز میں دفتر سے آیا تو بیوی بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک خط پڑا تھا۔ یہ اس کی بیٹی کا خط تھا جو اُس نے

کراچی سے لکھا تھا۔ میں نے خط پڑھا۔ بیٹی نے اپنی ماں کو لکھا تھا کہ میں اپنے خاوند کو چھوڑ کر ایک ایسے آدمی کے ساتھ کراچی آگئی ہوں جو مجھے اچھا لگتا ہے اور اس کے دل میں میری محبت ہے'— اس کے آگے اُس نے جو باتیں لکھیں ان سے میں ہِل گیا۔ اُس نے ماں کو لکھا کہ آپ نے مجھے جس سوسائٹی میں دھکیلا تھا اس میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس سوسائٹی کے نوجوان بہنوں کو بہنیں اور بیویوں کو بیویاں نہیں سمجھتے۔ آپ کی حوصلہ افزائی سے میں ان لڑکوں میں اٹھتی بیٹھتی رہی۔ آپ نے جس کے ساتھ میری شادی کی تھی اس کی میں پہلے ہی بیوی بنی ہوتی تھی۔ نکاح کی رسم آپ نے ادا کی میرا خاوند شادی کے بعد بھی میرا نہ ہُوا کیونکہ وہ بھی اسی رنگ میں رنگا ہُوا تھا۔ اب اُس نے مجھے روپیہ پیسہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا تو میں نے سوچا کہ بیوی بن کر ہی رہنا ہے تو کسی اچھے آدمی کی بیوی کیوں نہ بنوں۔ مجھے وہ اچھا آدمی مل گیا ہے اور میں ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں، مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جائیں'— اس کے بعد اُس نے مجھ سے معافی مانگی تھی کہ وہ میرے پیار کی قدر نہ کر سکی ....

"اُسی رات اُس کا خاوند آگیا۔ اُسے بھی لڑکی کا خط ملا تھا۔ یہ نوجوان بڑی گرماگرمی میں آیا تھا۔ میں نے اُسے خوب سُنائیں لیکن اُس نے یہ کہہ کر ہمارا منہ بند کر دیا کہ لڑکی بدکار تھی۔ شادی سے پہلے اس کے قابلِ اعتراض تعلقات اس لڑکے کے ساتھ تھے۔ شادی کے بعد دو اور سے پیدا کر لئے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ خود بھی تو ایسا ہی ہے۔ اُس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا کہ ہاں میں ایسا ہی ہوں۔ میں آپ لوگوں کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ وہ کہیں بھاگ گئی ہے۔ میں اُسے ڈھونڈوں گا نہیں۔ جائے جہنم میں۔ مجھے بیویوں کی کمی نہیں ....

"اُس نے میری بیوی سے کہا —'تم ہمارے مقابلے میں کیا ہو۔ تم اس خاوند کے نام پر لوگوں سے رشوت کھا کھا کر بڑی بیگم بنی پھرتی ہو۔ تمہاری بیٹی نے مجھے فخر سے بتایا تھا کہ میری امّی کے پاس بہت پیسہ ہے۔ اُس

نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ پیسہ کہاں سے آتا ہے ....

"وہ بکتا رہا اور میری بیوی کا رنگ لاش کی طرح ہوتا گیا۔ میں نے بڑے غصّے سے لڑکے کو ڈانٹ کر گھر سے نکال دیا۔ پھر میں اپنی بیوی اور اس کی بیٹی کے جرائم سُن کر بھی بیوی کی ڈھارس بندھانے لگا۔ اسے طعنے دینے کی بجائے میں نے اُسے پیار سے تسلیاں دیں۔ وہ توریت کی ڈھیری بن چکی تھی۔ وہ اُٹھی اور بخدا میرے پاؤں میں گر پڑی۔ وہ بہت روئی اور پھر اُس نے اعتراف کیا کہ وہ میرے نام پر رشوت اور تحفے لیتی رہی ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اس نے سوسائٹی کے بہاؤ میں بہہ کر اپنی بیٹی کو بھی تباہ کیا ہے ....

"اس واقعہ کو دو مہینے ہو گئے ہیں۔ میری بیوی کی بیٹی کی اور کوئی اطلاع نہیں آئی۔ میری بیوی میرے اشاروں پر ناچتی ہے لیکن میں اسے نچاتا نہیں۔ اب وہ ویسی بیوی بن گئی ہے جیسی میں چاہتا تھا۔ اس نے یہاں تک مجھے کہا — 'میں آپ کو بچّہ نہ دے سکی۔ آپ میری موجودگی میں دوسری شادی کر لیں۔ میں آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔ آپ کا بچّہ ہونا چاہیئے' — میں نے اسے کہا کہ ایسا کبھی نہیں سوچوں گا .... اب ڈاکٹر صاحب! میں ایسا سوتا ہوں کہ صبح بیوی جگاتی ہے۔"

اس کے بعد میں نے زبیر کو کبھی نہیں دیکھا۔

چُھری جو گر پڑی

اُس وقت اُس کی عمر چالیس سال اور کچھ مہینے تھی۔ وہ پاکستان کی ایک صوبائی حکومت کا گزٹیڈ افسر کلاس وَن تھا۔ اُسے ابھی اور ترقی کرنی تھی اور اگر زیادہ نہیں تو پندرہ سال مزید سروس کرنی تھی لیکن اُس نے اپنی بیماری سے تنگ آکر استعفیٰ دے دیا تھا۔ اُس کا مرض ایسا پیچیدہ اور خطرناک نہیں تھا کہ وہ سروس میں نہ رہ سکتا مگر وہ کہتا تھا کہ وہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اُسے ذرا سی بات پر غصّہ آجاتا تھا، اور جب غصّہ نہیں آتا تھا تو اُسے رونا آتا تھا اور اپنے آپ پر بھی اُسے غصّہ آیا رہتا تھا۔ اُس نے غصّے کا اظہار اس طرح بھی کیا تھا کہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں اُس نے اپنے چار قیمتی پین توڑ دیئے تھے۔

ڈاکٹر ممتاز حسین بھٹی صاحب نے مجھے یہ کیس سنانے سے پہلے کہا کہ وہ یہ کیس سنا تو دیں گے لیکن اسے سچا نہیں سمجھا جائے گا۔ ہمارے ملک میں نفسیات کے علم کو کوئی نہیں سمجھتا۔ انسان کی نفسیات ایسی حرکتیں کراتی ہے کہ لوگ اپنی آنکھوں دیکھ کر بھی یقین نہیں کرتے کہ کسی انسان نے یہ حرکت کی ہے۔ یہ کیس نفسیاتی ردِّ عمل کا کیس ہے جو نفسیات کے ڈاکٹروں کے لئے عجیب نہیں۔ ڈاکٹر بھٹی نے یہ کیس اِس طرح سُنایا:

پاکستان کی ایک صوبائی حکومت کا یہ افسر جسے اصلی نام کی بجائے ہم عثمان کہیں گے، جب میرے پاس آیا اُس وقت تک وہ چار بڑے اچھے ڈاکٹروں کے زیرِ علاج رہ چکا تھا۔ اُس نے دو حکیموں سے بھی علاج کرایا تھا مگر مرض قابو میں آنے کی بجائے خراب ہو رہا تھا۔ اُسے استعفیٰ

دیتے ایک سال ہوگیا تھا۔

اُس نے جو علامات بتائیں وہ یہ تھیں ۔۔۔ ہاضمہ دُرست نہیں۔ قبض رہتی ہے یا دست لگ جاتے ہیں۔ زبان کا ذائقہ ہر وقت کڑوا رہتا ہے۔ گیس بہت پیدا ہوتی ہے۔ ذرا سی ایسی ویسی چیز کھانے سے ابکائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ دل پر گھبراہٹ طاری رہتی ہے۔ غصہ زیادہ آتا ہے۔ کسی فیصلے پر قائم رہنا مشکل ہے اور اپنے اوپر اعتماد نہیں۔ نیند نہیں آتی۔

اُس نے مجھے چاروں ڈاکٹروں کے نسخے دکھائے۔ ان تکالیف کی جو دوائیاں تھیں وہ مریض کو دی جا چکی تھیں۔ اُس کی جو ذہنی علامات تھیں وہ پیٹ کے اس مرض کی وجہ سے ہی ہو سکتی تھیں۔ قبض ہو جاتے تو طبیعت چڑچڑی ہو جاتی ہے اور مزاج میں جھنجھلاہٹ رہتی ہے میں نے اُس سے اُس کی غذا پوچھی اور اس میں کچھ ردّوبدل کر کے اُسے کہا کہ میں اُسے کوئی نئی دوا تو نہیں دے سکتا۔ چار ڈاکٹر ساری دوائیاں آزما چکے ہیں۔ السر کی دوائیاں بھی دی جا چکی تھیں۔ میں نے سوچ سوچ کر اُسے تین دنوں کے لئے دو دوائیاں دے دیں اور اُسے کہا کہ وہ تین روز بعد آئے۔

وہ تین روز بعد وہی رپورٹ لے کر آیا کہ کوئی افاقہ نہیں۔ میں نے اُسے ایک گولی نیند کی اور ایک ذہنی سکون کی لکھ دی اور اُسے کہا کہ یہ صرف تین دن لے اور اس کے بعد میرے پاس آئے۔

اب وہ میرے پاس آیا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ اُس نے معدے کی تکلیف میں میری توقع سے بڑھ کر افاقہ محسوس کیا تھا۔ اُس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہی گولیاں دیں۔ میں نے اتنے عرصے بعد پہلی بار آرام محسوس کیا ہے۔

میں اُسے یہ گولیاں نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ تو میں نے ایک آزمائش کی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اتنے قابل ڈاکٹروں کی دوائیوں سے یہ ٹھیک نہیں ہوا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے جو معدے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ کوئی غم بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ

اُس نے خود استعفیٰ نہیں دیا بلکہ اسے مجبور کیا گیا ہے کہ استعفیٰ دے دے۔ مجھے اس کے ساتھ بے انصافی ہو جانے کا بھی شک ہوا اور یہ خیال بھی آیا کہ اُس کے ضمیر پہ کسی جُرم کا بوجھ ہوگا یا اسے کسی ایسے جُرم کی سزا دی گئی ہے جو اس نے نہیں کیا۔ یہ کسی عزیز کی موت کا اثر بھی ہو سکتا تھا۔

یہ معدے کی ہی تکلیف تھی لیکن اس کا باعث ذہنی تھا۔ اعصاب بھی متاثر تھے۔ ہمارے ملک میں نفسیاتی وجوہات کی بنا پر جسمانی امراض کے کیس خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ دوائیاں ان امراض کو وقتی طور پر دبا لیتی ہیں لیکن یہ امراض ختم نہیں ہوتے۔ ایسے مریضوں کی صحت مستقل طور پر بحال کرنے کے لئے ان کے ذہنوں کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے عثمان نے جب نیند اور سکون والی گولیوں سے معدے کی خرابیوں میں افاقہ محسوس کیا تو اُس نے کہا کہ میں اُسے یہی دوائیاں دوں۔

"نہیں" ۔۔۔ میں نے اُسے کہا ۔۔۔ "میں آپ کو ہمیشہ کے لئے نشئی نہیں بناؤں گا۔ میں نے یہ گولیاں دے کر ایک ضروری ٹیسٹ کیا ہے۔ اس سے مجھے پتہ چل گیا ہے کہ آپ کے اس مرض کا باعث آپ کا ذہن ہے۔ میں نے آپ کے ذہن کو سُلا دیا تھا۔ اسے نشہ پلا دیا تھا۔ اس کے اثر سے اس نے آپ کے اعصاب اور معدے کو آزاد کر دیا تھا۔ اس ٹیسٹ نے مجھے یہ بتایا ہے کہ اس مریض کو اس کے ذہن سے آزاد کرنا ضروری ہے اور ذہن پر کوئی بوجھ ہے جو جب تک موجود ہے ذہن اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرے گا ... آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کیا غم اور دُکھ اندر ہی اندر اُٹھائے پھرتے ہیں؟ کیا کوئی ایسا عزیز فوت ہو گیا ہے جس سے آپ کو دلی محبت تھی یا آپ کے گھریلو حالات آپ کو پریشان کر رہے ہیں؟"

وہ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ وہ میری تشخیص کو سمجھ گیا لیکن وہ بتانے سے جھجک رہا تھا۔ اُس نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ میری تشخیص صحیح ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اُس کے ذہن اور ضمیر پہ جو بوجھ ہے وہ میرے آگے رکھنے سے ڈر رہا ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ کسی گناہ کا بوجھ ہے۔ میں

تھا نیدار تو نہیں تھا کہ اُس سے اقبالِ جرم کرانا ضروری تھا اور پھر اسے سزا دلانی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ صحت یاب ہونا چاہتا ہے تو میں نے جو پوچھا ہے وہ مجھے بتا دے۔ میں نے زور دے کر کہا کہ وہ اگر یہ گولیاں کھاتا رہے گا تو اس کی حالت عادی افیمی اور چرسی جیسی ہو جائے گی۔ وہ جذباتی طور پر مر جائے گا اور وہ ان گولیوں کے زیرِ اثر چلتا پھرتا ایک جسم رہ جائے گا۔

"میں آپ کو اپنے دل کا سارا حال سُنا دوں گا ڈاکٹر صاحب!" ـــــ اُس نے کہا ـــ "لیکن اس کا آپ کے پاس کوئی علاج نہیں۔ آپ پہلے ڈاکٹر ہیں جنہوں نے مجھ سے میرے ذہن کی بات پوچھی ہے۔ میں خود چاہتا ہوں کہ اپنا سینہ آپ کے آگے خالی کر دوں۔"

"میں سائیکارلسٹ نہیں ہوں" ـــ میں نے کہا ـــ "لیکن اتنی عمر ہو گئی ہے کہ تجربے اور مشاہدے کی بنا پر مریض کی کچھ نہ کچھ تشفّی کر سکتا ہوں .... بعض دُکھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ذہن میں دبائے رکھو تو یہ گلتے سڑتے اور زہر بنتے رہتے ہیں اور جسم کی یہی حالت کر دیتے ہیں جو آپ کی ہو گئی ہے۔ یہ اگر کسی کو سُنا دو تو یہ زہر نہیں بنتے۔ طبیعت ہلکی پُھلکی ہو جاتی ہے .... مجھ پر اعتبار کریں۔ ہو سکتا ہے میں اس میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

اُس نے کھسیانہ ہو کر اپنا جو دُکھ مجھے سُنایا وہ میں آپ کو اُسی کے الفاظ میں سُناتا ہوں۔ یہ ۱۹۵۷ء کا واقعہ ہے۔ ابھی ایوّب خان کا مارشل لاء نہیں لگا تھا۔ کرپشن، رشوت خوری اور سرکاری دفتروں میں کام چوری اور من مانی کا یہ عالم تھا کہ افسر تو نواب بنے ہی ہوتے تھے، ادنیٰ درجے کے سرکاری اہلکاروں کو جو اختیارات حاصل تھے، ان سے کہیں زیادہ بڑھ کر وہ عوام سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ عدالتوں اور کچہریوں میں انصاف نیلام ہوتا تھا۔ معمولی سا افسر اپنے ماتحتوں کو اپنے ذاتی نوکر سمجھتا تھا۔ عثمان اُس دَور کا افسر تھا۔

"جب پاکستان بنا اُس وقت میں اَپر ڈویژن کلرک تھا" ـــ عثمان نے میرے کہنے پر کہ وہ مجھے ذہن میں چھپائی ہوئی ہر ایک بات سُنائے، کہا ـــ "میری سروس تیرہ سال ہو چکی تھی۔ میں جنگِ عظیم سے پہلے کلرکی کی آسامی

پر لگا تھا۔ خوشامد تو اُس وقت بھی چلتی تھی لیکن یہ حال نہیں تھا جو آج آپ دیکھ رہے ہیں۔ زیادہ تر خوشامد مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی کیونکہ دفتروں کے ہیڈ کلرک وغیرہ ہندو ہُوا کرتے تھے۔ اُن کی کوشش ہوتی تھی کہ مسلمان ماتحتوں کو ترقی نہ کرنی دی جائے یعنی جو کلرک بھرتی ہُوا ہے وہ ساری سروس کلرکی میں ہی گزار جائے۔ وہ مسلمان اہلکاروں کو نقصان پہنچانے کے موقعے پیدا کرتے رہتے تھے۔ اپنی نوکری محفوظ رکھنے کے لئے اور ترقی کے لئے بھی مسلمانوں کو ہندو افسروں کی چاپلوسی کرنی پڑتی تھی ....

"انگریز افسروں کی خوشامد تو ہندوستانی افسر اور تمام اہلکار عبادت کی طرح کرتے تھے۔ انگریزوں کی فطرت میں خوشامد پسندی نہیں تھی لیکن جو ہندوستانی ان کی خوشامد کرتے تھے اُن کو وہ روکتے نہیں تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو مکمل غلامی میں رکھتے تھے۔ وہ ترقی خوشامد کی بنا پر نہیں دیتے تھے۔ وہ کام کرنے والوں کی قدر کرتے تھے۔ رشوت اور کام چوری کو وہ برداشت نہیں کرتے تھے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو وہ نہیں بخشتے تھے۔ انگریزوں نے تقریباً آدھی دُنیا پر حکومت کی ہے اور ساری دُنیا سے تسلیم کرایا ہے کہ انگریز اپنے فرائض کی ادائیگی میں دیانتدار ہوتا ہے۔ انگریز انصاف پسند تھا۔ یہی اوصاف تھے جنہوں نے انگریز کو آدھی دُنیا کا بادشاہ بنایا تھا ....

"مجھے بھی ہندو ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ کام چوری کی تو مجھے عادت ہی نہیں تھی۔ خوشامد اور محنت سے میں اَپر ڈویژن کلرک بنا تھا۔ جب پاکستان بنا تو غیر مسلموں کے ہندوستان چلے جانے کی وجہ سے اوپر کی آسامیاں خالی ہو گئیں۔ انہیں مجھ جیسے آدمیوں سے پُر کیا گیا اور مجھے تیزی سے ترقی ملتی گئی، حتیٰ کہ مجھے گزیٹیڈ پوسٹ مل گئی اور اپنے محکمے کے ایک شعبے کا مجھے انچارج بنا دیا گیا ....

"پاکستان کی سِول سروس میں جس چیز کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فروغ مِلا، وہ تھی خوشامد۔ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے

افسر تک کا رویہ یہ ہو گیا کہ کام کرو نہ کرو، یہ تسلیم کرو کہ میں افسر ہوں اور تم میرے ماتحت نہیں میری رعایا ہو۔ ہم لوگ جو ہندو افسروں کی خوشامد کے عادی تھے اپنے پاکستانی افسروں کی خوشامدیں کرنے لگے۔ ہمارے افسروں نے خوشامد کو ہی ترقی کا پیمانہ بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سب کی توجہ کام سے ہٹ گئی۔ پھر خوشامد ایک آرٹ اور ایک فن بن گیا۔ خوشامدیوں نے صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے طریقے ایجاد کئے جو میں آپ کو سناؤں تو آپ انہیں سچ نہ مانیں....

"عام قسم کے تحفے تو پرانی اور بیکار بات ہو کے رہ گئی، یار لوگ صاحب کو عورتیں سپلائی کرنے تک آ گئے۔ چپڑاسی افسروں کے گھروں میں جا کر کوئی خدمت، معلوم کرنے لگے، پھر صاحب کے گھر میں رشوت کا حصہ پہنچنے لگا۔ افسر بے تاج بادشاہ اس طرح بنے کہ ایسے واقعات اکثر سُننے میں آتے تھے کہ فلاں افسر کی بیگم دفتر میں آئی تو جس کلرک یا کسی اور ماتحت نے اُٹھ کر سلام نہ کیا، اُس کی جواب طلبی ہو گئی....

"جو ماتحت چاپلوسی کے ذریعے رُتبے حاصل کرتے تھے وہ اپنے ماتحتوں سے چاپلوسی کا مطالبہ کرتے تھے۔ بعض اہلکاروں کو ترقی سے محروم ہونا پڑا اور بعض کو نوکری سے سبکدوش کر دیا گیا کیونکہ وہ چاپلوس نہیں تھے۔ کیا آپ تسلیم کریں گے کہ ایسے اہلکار بھی میں نے دیکھے ہیں جو ترقی کی سفارش کے لئے یا ان کے خلاف کوئی شکایت ہو گئی تو اس کی انکوائری اور سزا سے بچنے کے لئے اپنی بیویوں کو اپنے صاحبوں کے ہاں بھیج دیتے تھے؟....

"اُس دَور کا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہُوں۔ ایک سرکاری محکمے کے ایک شعبے کا ایک چھوٹا افسر رشوت خوری اور غبن کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ تین مرتبہ پکڑا گیا اور تینوں مرتبہ اُس نے اپنی بیوی کو متعلقہ دو افسروں کے ہاں بھیجا اور اُس کا جُرم دب گیا۔ اُس کی بیوی خوبصورت بھی تھی اور جوان بھی اور وہ شریف عورت نہیں تھی۔ چوتھی مرتبہ اس شخص پر ایک اور کیس بن گیا۔ اُس نے اپنی بیوی کو بھیجا کہ وہ کیس رفع دفع کرا آئے۔

وہ گئی اور پھر واپس ہی نہ آئی۔ اس افسر کو ایک خفیہ پیغام مِلا کہ اُس کا کیس گول کر دیا جائے گا، بشرطیکہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ چنانچہ اُس نے بیوی کو طلاق دے دی اور یہ خوبصورت عورت ایک بڑے افسر کی دوسری بیوی بن گئی....

"آپ سے تو کچھ چھُپا ہُوا نہیں ہے۔ آج کل (۱۹۵۷ء) آپ دیکھ رہے ہیں کہ مہنگائی کِس بے رحمی سے بڑھ رہی ہے۔ آپ کا کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں چلتا۔ آپ کے گھر میں چوری ہو جائے، آپ کے گھر کی عزت برباد ہو جائے، آپ کی فریاد کوئی نہیں سُنے گا۔ سرکاری دفتروں میں کام چوری کا دَور دَورہ ہے۔ چاندی اُن کی ہے جو اپنے افسروں کو خوش رکھتے ہیں.... میں بھی اسی مشینری کا کل پرزہ تھا۔ پاکستان بنا تو میں نے پہلے ڈیڑھ دو سال اپنے جذبے اور فرض کا احترام کیا۔ میں کہا کرتا تھا کہ اپنا ملک اور اپنی آزاد قوم ہے، میں دیانتداری سے کام کروں گا۔ میں نے دیانتداری سے ہی کام کیا لیکن صاحب بہادر نے اپنی زبان سے تو نہ کہا اپنی حرکتوں سے جتا دیا کہ پہلے سلام کرو، پھر صاحب کی خوشنودی کا خیال رکھو، بعد میں کام کرو....

"میں آسمان سے اُترا ہُوا فرشتہ نہیں تھا۔ میں نے جب نااہل اور کام چور اہلکاروں کو ترقیاں اور عہدے لیتے دیکھا تو میں بھی اسی رنگ میں رنگا گیا۔ جب مجھے افسری اور ایک شعبے کی بادشاہی مل گئی تو میں نے بھی خوشامد کو پسند کیا۔ جب ماتحت جُھک کر سلام کرتے تھے تو میری گردن اُونچی ہو جاتی تھی۔ ماتحتوں نے مجھ میں فرعونیّت پیدا کر دی۔ ایک کلرک کو میں نے معمولی سی بدتمیزی پر نوکری سے نکلوا دیا....

"میرا ایک چپڑاسی تھا۔ اُس کی عمر چالیس سال سے شاید دو تین سال کم ہو گی۔ اُس کی بیوی مر گئی تھی۔ اُس نے دوسری شادی کر لی۔ اُس کی دوسری بیوی خاصی اچھی شکل وصورت اور بڑے پیار سے قد بُت کی ہے۔ وہ میرے گھر سے تھوڑی ہی دُور چھوٹے سے ایک مکان میں رہتا ہے۔

ایک شام وہ اپنی نئی بیوی کو میرے گھر بس لے آیا۔ میں نے پہلی بار اُس کی یہ بیوی دیکھی۔ چپڑاسی نے اپنی بیوی سے کہا کہ جا بیگم صاحبہ کو سلام کر۔ پاؤں چُھو کر سلام کرنا اور اُن کی برابری میں نہ بیٹھنا....

"میں نے چپڑاسی کو بٹھایا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کو کئی بار کہا لیکن اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — 'حضور! گناہگار نہ کریں' — یہ چپڑاسی چاپلوسی میں خصوصی مہارت رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چاپلوسی سے وہ پتھر کو بھی موم کر سکتا ہے۔ اُس نے مجھے کہا کہ میرے گھر میں اگر ضرورت ہو تو وہ بیوی کو بھیج دیا کرے گا۔ میں نے کہا کہ گھر میں نوکر ہے، کسی اور کی ضرورت نہیں۔ اُس نے دو تین بار کہا کہ وہ بیگم صاحبہ کا ہاتھ بٹانے کے لئے اپنی بیوی کو بھیج دیا کرے گا لیکن میں نہ مانا....

"اُس کی پہلی بیوی سے جو بچے تھے وہ اُس کے ماں باپ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب وہ دوسری بیوی کے ساتھ اکیلا رہتا تھا.... اب میں آپ کو وہ بات سناؤں گا جو میں سنانے سے جھینپ رہا تھا۔ اس چپڑاسی کی بیوی میرے دل کو بہت اچھی لگی۔ وہ جانے لگا تو اُس نے اپنی بیوی کو کچھ دیر میرے سامنے کھڑا رکھا۔ وہ شاید اس کی نمائش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہا — 'یہ میرے اَن داتا ہیں۔ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ خُدا نے ان کو بہت اختیار دیا ہے اور یہ بڑے سخی افسر ہیں'....

"وہ دو مرتبہ پھر اپنی بیوی کو میرے گھر لایا۔ میں نے ایک مرتبہ اس عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دوسرے دن میں دفتر سے دس ساڑھے دس بجے نکلا اور چپڑاسی سے یہ کہہ کر چل پڑا کہ میں ایک گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا۔ میں سیدھا چپڑاسی کے گھر جا پہنچا۔ اُس کی بیوی نے مجھے دیکھا تو حیران ہو گئی۔ میں نے اُس کے حُسن کی تعریف کی اور زبان کا جادو چلایا۔ وہ جال میں آ گئی۔ وہاں سے آتے ہوئے میں نے اُسے دس روپے دیئے۔ اُس نے کہا کہ اُس کے خاوند کو پتہ نہ چلے....

"اس کے بعد میں ہفتے میں ایک اور کبھی دو مرتبہ دفتر کے وقت میں چپڑاسی کو اپنے دفتر کے سامنے بٹھا کر اُس کے گھر چلا جاتا.... تقریباً چھ مہینے یہ سلسلہ چلا۔ چھٹے مہینے چپڑاسی کی بیوی نے مجھے دو تین مرتبہ کہا کہ اُس کے خاوند کو شک ہو گیا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے خاوند نے اُسے کہا ہے کہ محلّے کے دو آدمیوں نے اُسے بتایا ہے کہ اس کی غیر حاضری میں اُس کے گھر ایک آدمی آتا ہے۔ چپڑاسی نے اپنی بیوی کو دھمکی دی تھی کہ یہ بات اگر سچ ہے تو وہ باز آ جائے ورنہ وہ اسے اور اس کے آشنا کو قتل کر دے گا....

"گناہ کا بھوت سوار ہوتا ہے تو انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ میں نے چپڑاسی کی دھمکی کی پرواہ نہ کی اور اُس کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ کچھ ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایک روز میں اُس کے گھر میں تھا اور وہاں سے واپس جانے ہی لگا تھا کہ دروازہ بڑی زور سے کھٹکا۔ اُس روز میں زیادہ وقت کے لئے وہاں بیٹھا رہا تھا۔ چپڑاسی کی بیوی نے ڈر کر کہا کہ وہی ہوگا۔ اس طرح کبھی کسی نے دروازہ نہیں کھٹکٹایا....

"میرے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس مکان کے دو ہی کمرے تھے۔ صحن میں سے سیڑھیاں اُوپر جاتی تھیں۔ ان کے نیچے جو جگہ تھی وہاں گھر کا کوڑا کباڑ، اُپلے اور لکڑیاں پڑی تھیں۔ اس عورت نے مجھے وہاں گھُس جانے کو کہا۔ میں فوراً وہاں گھُس گیا۔ اُس نے آگے دو چارپائیاں کھڑی کر دیں اور دروازہ جو ایک بار پھر بج چکا تھا، کھولا....

"اُس عورت نے کہا — 'میری آنکھ لگ گئی تھی' — مجھے اپنے چپڑاسی کی آواز سنائی دی۔ اُس نے پہلے اپنی بیوی کو دو تین گالیاں دیں پھر کہا — 'فوراً بتاؤ وہ کہاں ہے' — وہ دونوں کمروں میں گھوم گیا۔ بیوی نے بناوٹی غصّے سے کہا کہ وہ اُسے کیوں بدنام کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ یہاں تو کوئی نہیں۔ چپڑاسی نے کہا — 'میں نے ایک آدمی کو کل ہی کہا تھا کہ میرے گھر میں کوئی آدمی آئے تو مجھے اطلاع دے۔ آج مجھے اطلاع مِل

گئی ہے۔ بتاوہ کہاں ہے‘....

”میں جہاں تھا وہاں کانپ رہا تھا۔ وہ بدبودار جگہ تھی اور وہاں جالے بھی تھے۔ چپڑاسی کی بیوی نے ایک بار واویلا کیا تو مجھے پتہ چلا کہ چپڑاسی نے چھری اُٹھالی ہے۔ وہ اب غصّے سے پاگل ہونے لگا تھا۔ اُس نے وہ دونوں چارپائیاں اُٹھا کر پرے پھینک دیں جن کے پیچھے میں چھُپا ہُوا تھا۔ اُس نے میرے جسم کا پچھلا حصّہ دیکھ لیا۔ میری ابھی زندگی کے کچھ دن باقی تھے کہ اُس نے چھری میری پیٹھ میں نہ اتاری۔ اُس نے مجھے پیچھے سے پکڑا اور گھسیٹ کر باہر نکالا۔ گھسیٹتے ہوتے اُس نے غضبناک آواز میں کہا—’یہ دو خون میرے ہاتھ پہ لکھے ہوتے ہیں‘....

”میں سیدھا ہو کر اُس کے سامنے ہُوا اور میں قتل ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے میرا چہرہ دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔ میرے کپڑوں پر، سر اور مُنہ پر گرد پڑ گئی تھی۔ ایک دو جالے بھی چپک گئے تھے۔ چپڑاسی کے مُنہ سے نکلا—’آپ؟ حضور! یہ آپ ہیں؟‘—میری تو زبان بند ہو گئی تھی۔ اُس کی بیوی اُس کے پاس کھڑی کانپ رہی تھی۔ اُس کا رنگ زرد ہو چکا تھا....

”چپڑاسی نے گھوم کر اُس کے مُنہ پر تھپڑ مارا اور تین چار گالیاں دے کر کہا—’تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟ تمہیں صاحب کو چھپانے کے لئے یہی جگہ ملی تھی؟ یہ دیکھ ان کے کپڑوں کا کیا حال کر دیا تو نے؟‘— اور اُس نے چھری پھینک کر میرے کپڑے جھاڑنے شروع کر دیتے۔ اُس نے اپنی بیوی سے غصّے سے کہا—’کھڑی مُنہ کیا دیکھ رہی ہے۔ سلابچی اور لوٹا لا۔ صاحب کا مُنہ دُھلا‘—اُس نے مجھ سے معافی مانگی....

”اگر یہ شخص مجھے قتل کر دیتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا اور سر جھکاتے ہُوتے اُس گھر سے نکل آیا۔ دفتر جانے کی بجائے میں اپنے گھر چلا گیا۔ میں نے راستے میں کپڑے اور بال جھاڑ لئے تھے۔ میرے جسم کے اندر جیسے آگ لگ گئی تھی۔ کبھی ایسے پتہ چلتا جیسے میرے جسم میں خون

نہیں اُبلتا ہُوا پانی پھر رہا ہے۔“

”یہ ندامت کا اثر تھا“—میں نے کہا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب“—اُس نے کہا—”ندامت نہیں۔ مجھے اس سوچ نے جلانا شروع کر دیا تھا کہ میری قوم بے غیرتی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ خوشامد اور صاحب کی خوشنودی پر اپنی بیویاں بھی استعمال ہو رہی ہیں۔ ہم نے ان غریبوں کو کس پستی تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ہمارا گناہ ہے جو چاپلوسی کے ذریعے افسر بنے اور ماتحتوں سے چاپلوسی کرائی....میں نے یہ سُنا تھا کہ اپنا کام نکلوانے کے لئے عورت کو استعمال کیا جا رہا ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے جو میرے ساتھ ہُوا تھا....

”یہ بالکل دُرست ہے کہ ہر خوشامدی یوں نہیں کرتا اور ہر کوئی میرے چپڑاسی کی طرح بے غیرت نہیں لیکن ایک آدمی کو ذِلّت کی اس حد تک جاتے دیکھا تو یوں لگا جیسے اور لوگ بھی ہیں جو اس ذِلّت تک پہنچ جاتے ہیں۔ میرا چپڑاسی مجبور تھا۔ اُس کی غیرت کی موت میرا گناہ ہے ....ڈاکٹر صاحب! میں نے اپنے آپ کو کوئی دھوکہ نہ دیا۔ میرے سامنے وہ دن آ گئے جب قوم پاکستان حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دے رہی تھی۔ مجھے وہ لاکھوں مُسلمان یاد آئے جنہیں آزادی ملتے ہی قتل کر دیا گیا تھا....

”میں یہ سوچ سوچ کر بے چین اور پریشان ہوتا چلا گیا۔ میری بیوی نے مجھے کھانے کے لئے بلایا تو میں کھانے پر جا بیٹھا لیکن بھوک مر گئی.... دوسرے دن دفتر جانے سے طبیعت گھبرا رہی تھی۔ میں اپنے چپڑاسی کے سامنے جانے سے ڈر رہا تھا مگر دفتر جانا تھا اور میں چلا گیا۔ چپڑاسی دروازے میں کھڑا تھا۔ اُس نے روزمرّہ کی طرح مجھے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ اُس کے چہرے پر غصّہ نہیں تھا ہنسی بھی نہیں تھی۔ میں اندر جا کر بیٹھ گیا....

”چپڑاسی اندر آیا اور بولا—’حضور! ایک عرض ہے‘—مجھے توقع تھی کہ وہ کہے گا کہ وہ میرے دفتر میں نہیں رہنا چاہتا لیکن اُس نے کہا—’میں نے نو جماعتیں پاس کر لی تھیں۔ دسویں میں گیا تو باپ مر گیا۔ مجھے سکول چھوڑ

کر نوکری کرنی پڑی۔ دو سال دکانوں پر نوکری کی پھر سرکاری نوکری
مل گئی۔ سولہ سترہ سال سے چپڑاسی ہوں۔ مجھے اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ کلرکی
کر سکتا ہوں۔ آپ کی جناب میں کیا کمی ہے۔ مجھے میٹرک لکھ کر کلرکی کی
جگہ دلا دیں۔ غریب آدمی ہوں۔ تنخواہ ذرا اچھی ہو جاتے گی'....

"میں نے صرف سر ہلایا کہ کچھ کروں گا.... اور میں نے اُسے میٹرک
فسٹ ڈویژن لکھوا کر قاعدے قانون کے سراسر خلاف کلرکی دلوا دی۔
پھر اُسے اپنے ہی شعبے میں رکھنے کا انتظام کر لیا۔ وہ دوسرے تیسرے
دن مجھے دعائیں دینے آتا تھا لیکن میں اُس کے ساتھ کوئی بات نہیں
کرتا تھا۔ میں پھر کبھی اُس کے گھر نہ گیا۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر میرے گھر
کبھی کبھی آتا تھا لیکن میں اُس کی بیوی کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا....

"میری طبیعت میں غصّہ بھرنے لگا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش
کی لیکن میری ذہنی حالت بگڑتی گئی۔ یہی ایک سوچ ذہن میں گھومتی رہتی کہ
ہم لوگ ذلّت کی آخری حد تک پہنچ گئے ہیں اور اپنے ماتحتوں کو ذاتی
اور قومی وقار سے محروم کرتے جا رہے ہیں۔ میری نیند ختم ہو گئی۔ دفتر میں
کام کرنا مشکل ہو گیا اور پھر میرے معدے میں یہ خرابی شروع ہو گئی ——
دفتر میں میری حالت بگڑنے لگی۔ میں اپنے آپ سے اتنا تنگ آ گیا کہ ایک
روز استعفیٰ دے دیا۔ ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔ میرا جسم کھوکھلا ہو گیا ہے۔"

میرے پاس سوائے لیکچر کے کوئی علاج نہیں تھا۔ میں نے اُسے
کہا کہ جو ہو گیا ہے وہ ہو گیا ہے اور اُس نے بہت حد تک ازالہ کر دیا
ہے۔ اُس چپڑاسی کو کلرک لگوا دیا ہے اور اُس نے چپڑاسی کی بیوی سے
تعلقات توڑ لئے تھے اور اُس نے استعفیٰ دے کر اور اپنا مستقبل تباہ کر کے
اپنے آپ کو سزا دے لی ہے۔ پھر ڈیڑھ سال سے وہ اپنے آپ کو سزا
دے رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اب خُدا نے اُسے معاف کر دیا
ہو گا

اپنا سینہ خالی کر کے اُسے کچھ سکون ملا جس کا اُس نے اعتراف کیا۔

میں نے اُسے کہا کہ وہ میرے پاس آتا رہے۔ وہ دو روز بعد آیا تو میں نے
اُسے ایک لیکچر دیا۔ پھر وہ میرے پاس سات آٹھ مرتبہ آیا۔ اب اُسے نیند
آنے لگی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھا کرے اور خُدا
سے بخشش مانگا کرے۔

تقریباً دو ماہ بعد اُس کی ذہنی حالت بہتر ہونے لگی اور پھر میں نے
اُسے اچھی صحت میں دیکھا۔ اُس کا معدے کا مرض ختم ہو گیا۔

"اب آپ کو کھوئی ہوئی صحت واپس مل گئی ہے" —— میں نے اُسے
ازراہِ مذاق کہا —— "اب اُس عورت کی طرف توجہ نہ دینا۔ وہ اپنے خاوند کے
ساتھ آپ کے گھر آتی رہتی ہے؟"

وہ ہنس پڑا اور بولا —— "یہ مجھے ایک اور سبق ملا ہے۔ جب سے میں
نے استعفیٰ دے دیا ہے یہ شخص کئی بار میرے سامنے آیا ہے۔ یقین کریں
ڈاکٹر صاحب! میں نے اُسے سلام کیا اور اُس نے بے رخی سے جواب
دیا جیسے وہ مجھے پہچانتا ہی نہیں۔"

دُوسری طلاق کے بعد

میرے اس مریض کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ جسم بہت اچھا۔ قد اُونچا اور کشش والا اور چہرہ بھی دل کو اچھا لگتا تھا۔ خدوخال اچھے ہونے کے ساتھ ساتھ رنگت بھی بڑی اچھی تھی۔ اُسے پیٹ کی شکایت تھی۔ کبھی قبض ہو جاتی اور کبھی دست آنے لگتے۔ قبض کی صورت میں اُس کا سَر درد سے پھٹنے لگتا تھا۔ مَیں نے علامات کے مطابق علاج کیا لیکن افاقہ نہ ہُوا۔ کبھی شک ہوتا کہ السر ہے۔

میں نے ڈیڑھ مہینہ دوائیاں بدل بدل کر دیں۔ اُس سے پرہیز بھی کرایا لیکن وہ کبھی صحت یاب ہوتا تو صرف ایک دن کے لئے پھر وہی حالت ہو جاتی۔ میں اتنا لمبا علاج نہیں کیا کرتا تھا۔ اُس کے پیٹ کی خرابی ایک مہینے کے اندر ٹھیک ہو جانی چاہیئے تھی مگر ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تھا۔ میں نے ایک روز اُسے بٹھا لیا اور اُسے کہا کہ اُس کا مرض نفسیاتی ہے اور وہ مجھے بتاتے کہ وہ ہر وقت غصّے میں رہتا ہے یا اُسے کوئی غم ہے یا وہ حسد کا عادی ہے یا وہ جلتا کُڑھتا رہتا ہے۔

اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ کہنے لگا کہ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اُس سے اُس کے دل کا حال پوچھے۔ اُس نے اپنے دل کا حال بتایا۔

دو سال گزرے اُس کی شادی ایک امیر بیوہ کی بیٹی سے ہوتی تھی۔ یہ بیوہ خود بھی خوبصورت عورت تھی اور اُس کی بیٹی اُس سے کئی درجے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس بیوہ کی اولاد ایک یہ لڑکی تھی اور ایک لڑکا جو اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ لڑکی کی عمر بیس اکیس سال تھی۔ لڑکا جسے میں

امجد کہوں گا آوارہ ہوگیا تھا۔ لڑکی کو ناہید کہہ لیں۔

میرے مریض راشد نے اس بیوہ کے متعلق یہ بتایا کہ اُس کے خاوند کو مرے سات آٹھ سال ہوگئے ہیں۔ اس کے بچّے صرف دو ہی پیدا ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ امیر تھی۔ کوئی غم اور کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اُس کا خاوند نقد روپیہ پیسہ بہت چھوڑ گیا تھا۔ شہر میں تین چار مکان اور دو تین دکانیں کرائے پر چڑھی ہوئی تھیں۔ جس مکان میں وہ رہتی تھی وہ بھی اُس کا اپنا تھا۔ گاؤں میں کچھ زمین تھی جو اُس نے بٹائی پر دے رکھی تھی۔ اُس کی صحت اتنی اچھی تھی کہ ابھی تک اُس کے چہرے پر جوانی موجود تھی۔ پردے کی پابندی سختی سے کرتی تھی۔ سُنا تھا کہ اُسے شادی کے پیغامات ملے جو اُس نے قبول نہیں کئے تھے۔

راشد مالی لحاظ سے کمزور تو نہیں تھا لیکن اس بیوہ کے پائے کا نہیں تھا۔ راشد کا باپ ریلوے میں تھا۔ ریٹائر ہُوا تو اُسے بہت ساری رقم ملی۔ وہ ایک سال بعد مر گیا۔ راشد کا بڑا بھائی شادی شُدہ تھا اور الگ رہتا تھا۔ راشد کی ایک بہن کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ اُس کی صرف ماں رہ گئی تھی جو راشد کے ساتھ رہتی تھی۔ راشد کے لئے ناہید کا رشتہ راشد کی بہن نے حاصل کیا تھا۔

ناہید اپنے ساتھ بہت سارا جہیز لائی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ راشد حیران رہ گیا۔ وہ اُس کا غلام ہوگیا۔ ناہید امیر بیوہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں نے اُسے شہزادی بنا رکھا تھا۔ راشد اُس کے اشاروں پر ناچنے لگا۔ ناہید نے راشد کی ماں کو نوکرانی بنا لیا۔ گھر کے سارے کام کاج راشد کی ماں کرتی تھی۔ راشد نے اپنی زندگی کا فرض یہ بنا لیا تھا کہ ناہید کو خوش رکھنا ہے۔ ناہید نے یہ وطیرہ بنا لیا کہ راشد سے ہر اُلٹی سیدھی بات منواتی اور اُس کی ماں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ کوئی بات نہ کرتی۔ ہفتے کے دو دن وہ اپنی ماں کے گھر گزارا کرتی تھی۔ وہاں سے آتی تو اُس کا مزاج کچھ بگڑا ہُوا ہوتا۔

اگر وہ راشد کے ساتھ بدسلوکی کرتی تو شاید راشد اُس سے تنگ آ

جاتا۔ وہ راشد کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی اور اُسے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ساتھ رکھتی — اُس کی محبت بہت جذباتی تھی۔ ناہید پر جذبات کا جو غلبہ تھا وہ مرد کی بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ پہلا بچّہ پیدا ہونے کے آثار نمودار ہُوئے تو ناہید ماں کے پاس چلی گئی۔ راشد بہت خوش تھا لیکن ناہید نے واپس آکر اُس کی خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ اُس نے بتایا کہ ماں نے اُسے کچھ کھلا کر اسی عمر میں ماں بن جانے کے جھنجھٹ سے نجات دلا دی ہے۔ اُس نے کہا کہ بچّے جننے سے جسم خراب ہوجاتا ہے۔

راشد کو ایک روز ماں نے کہا کہ اُسے بہت خوشی ہے کہ اُسے ایسی بیوی ملی ہے جو خوبصورت بھی ہے اور اُس کی محبت میں بے حال ہوتی رہتی ہے لیکن زندگی ہنسی کھیل اور عیش موج کا نام نہیں، وہ ناہید کو حقیقت کی طرف لانے کی کوشش کرے۔ ناہید اڑوس پڑوس کی عورتوں میں اُٹھے بیٹھے اور گھر کے کام کاج میں دلچسپی لے۔ یوں بن سنور کر رہنے اور اپنے خاوند کو اپنے ساتھ چپکائے رکھنے سے باعزّت زندگی نہیں گزرا کرتی۔

راشد نے ناہید کو یہی الفاظ کہہ دیئے۔ ناہید نے راشد کی ماں کے خلاف ایسی ایسی باتیں کہہ دیں کہ راشد کو غصّہ آگیا۔ وہ ان باتوں کو سچ سمجھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک الزام یہ تھا کہ راشد کی ماں کی خواہش یہ ہے کہ اُس کا بیٹا اور بہو ایک دوسرے سے محبت نہ کریں اور کمرے میں نہ گھُسے رہا کریں۔ راشد نے ماں کو جا نصیحت کی کہ وہ ناہید کو پریشان نہ کیا کرے بلکہ اُس کا حکم مانا کرے۔

"میں اگر ایسی ہوتی تو آج تک ناہید کے خلاف کئی بار تمہارے کان بھر چکی ہوتی"۔ ماں نے راشد سے کہا — "میں تو چاہتی ہوں کہ محلّے برادری میں تم دونوں کی عزّت ہو۔ عزّت دُنیا داری سے بنتی ہے"۔

یہاں سے یہ سلسلہ چل نکلا کہ ناہید نے راشد کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور اُسے اُس کی ماں کے خلاف بدظن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی

اُسے قائل کر لیا کہ وہ اُس کی ماں کے پاس زیادہ جایا کرے کیونکہ وہ بیچاری بیوہ ہے، تنہائی سے گھبراتی ہوگی۔ راشد جاتا ہی رہتا تھا۔ اب ناہید نے اُسے کہا تو اُس نے زیادہ جانا شروع کر دیا۔

راشد نے مجھے سنایا کہ ناہید کی ماں اُس کے ساتھ بچوں کی طرح پیار کیا کرتی تھی۔ راشد نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اس عورت کو اُس کے ساتھ اتنا زیادہ اور اس قسم کا پیار نہیں کرنا چاہیئے۔ بیشک وہ ساس تھی اور ساس ماں ہوتی ہے لیکن وہ اتنی صحت مند تھی اور اُس کے نقش و نگار ایسے تھے کہ وہ ناہید سے چند سال ہی بڑی لگتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں راشد اُس کے پیار کا عادی ہو گیا بلکہ وہ اس پیار کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔

ساس نے اپنے پیار کے جال میں پھانس کر اُسے اُس کی ماں کے خلاف کرنا شروع کر دیا۔ وہ بات اشاروں اشاروں میں اور ادھوری ادھوری کرتی تھی جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ سکتی ہو۔ اِدھر ناہید نے اس پر اپنی جسمانی محبت کا نشہ طاری کر رکھا تھا۔ وہ اُسے جو کچھ بتاتی اسے وہ سچ مانتا۔

اس دوران راشد کی شادی شدہ بہن اپنی ماں کے پاس آتی رہتی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کی حالت دیکھی تو بہت سٹپٹائی۔ اُس نے راشد کو بٹھا کر سمجھایا کہ وہ اپنی ماں کا دشمن نہ بنے اور اپنی بیوی کو لگام ڈالے۔ بہن نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اور ماں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہیں کہ اُسے خوبصورت بیوی ملی ہے جو اُسے اتنا زیادہ چاہتی ہے۔

بہن نے ایسے انداز سے باتیں کیں کہ راشد کے دل میں بہن کی محبت بیدار ہو گئی۔ راشد نے بہن کو بتایا کہ ناہید اس کی ماں کے خلاف کیا باتیں کرتی رہتی ہے۔ راشد اپنی ماں کو مجرم سمجھتا تھا۔ بہن نے ناہید کو بلا کر بٹھا لیا اور اپنی ماں کے سامنے اُسے کہا کہ اُسے اُس کی ماں کے خلاف جو شکائتیں ہیں وہ اُسے بتائے تاکہ وہ ماں کا رویہ صحیح کر جاتے۔ ماں نے بھی اُسے پیار سے کہا کہ دیکھو بیٹی، کوئی ماں اپنے بیٹے کی خوشیوں میں زہر نہیں گھولتی۔ مجھے بتاؤ

کہ میں کیا کرتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے ناراض ہو اور راشد بھی مجھ سے کھچا کھچا رہتا ہے۔

ناہید نے کہا کہ راشد کی ماں نہیں چاہتی کہ ہم کمرے میں بیٹھے رہا کریں۔ راشد کی بہن نے پوچھا کہ یہ شک اُسے کس طرح ہُوا ہے؟ ناہید کے پاس کوئی ٹھوس جواب نہ تھا۔ بہن نے وہ الزامات سنائے جو ناہید اُس کی ماں پر لگاتی تھی۔ ناہید آخر ناتجربہ کار لڑکی تھی، وہ گھبرانے لگی۔ وہ کوئی ٹھوس بات نہ کر سکی۔ وہ یوں اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی جیسے اُسے یہ باتیں سخت ناگوار گزری ہوں اور وہ بہت خفا ہو گئی ہو۔

اُس دن تک ازدواجی زندگی کا دوسرا سال ختم ہونے کو تھا۔ راشد کی مردانگی بیدار ہو گئی۔ ناہید نے اُسے اپنے ساتھ اتنا زیادہ چپکا کے رکھا تھا کہ وہ کچھ اُکتانے لگا تھا۔ اگر انتہائی لذیذ اور مرّغن کھانا ہر روز کھاتے رہو تو اس سے جی بھر جاتا ہے۔ ایسا ہی راشد نے محسوس کیا۔ بہن نے اُسے کچھ باتیں سمجھائیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ناہید کی ماں کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ راشد اپنی ماں سے الگ ہو کر اُس کے پاس آ کر رہے۔ وہ راشد کو گھر جوائی بنانا چاہتی تھی۔ راشد کا باپ مر چکا تھا۔ وہ اپنی بیوہ ماں کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

راشد کی بہن کہہ سُن کر چلی گئی۔ ناہید کو توقع ہو گی کہ راشد اُسے منانے کے لئے کمرے میں آئے گا مگر وہ نہ گیا۔ شام کے وقت ناہید نے راشد کو جلی کٹی کہہ دیں۔ راشد نے دو برسوں میں پہلی بار ناہید کو ڈانٹ دیا۔ ناہید نے راشد کی ماں کو بھی کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ راشد نے ناہید کو اور زیادہ ڈانٹ دیا۔ ناہید اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ راشد کی ماں نے راشد کو کہا کہ وہ ان دونوں کو یوں لڑتا جھگڑتا نہیں دیکھ سکتی۔ بہتر ہے کہ وہ کچھ دنوں کے لئے اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلی جاتے۔

ماں اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلی گئی۔ وہ اسی شہر میں رہتا تھا۔ راشد کو اپنا گھر خالی نظر آیا تو اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ ماں اُس سے ناراض ہو کر

نہیں گئی تھی لیکن وہ اپنے ضمیر پر جُرم کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔ وہ جب سے پیدا ہُوا تھا ماں سے الگ نہیں رہا تھا۔ اب ماں چلی گئی تو وہ ایسا بچّہ بن گیا جسے ماں گلی میں کھڑا کر کے غائب ہوگئی ہو۔ اس کے ساتھ یہ تاسّف کہ ماں پریشانی اور ناراضگی کی حالت میں گئی ہے۔

راشد عقل رکھتا تھا۔ اُس نے اس صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور اس پہلو پر غور کرنے لگا کہ ماں اپنے بڑے بیٹے کے پاس رہے اور وہ ناہید کو گھر لے آئے تو کیا ہوگا۔ اُس نے ناہید کی عادتوں اور فطرت پر غور کیا تو اُس میں اُسے کوئی ایک بھی خوبی نظر نہ آئی۔ اُس میں گھریلو پن تھا ہی نہیں۔ وہ ذرا سا بھی تعاون نہیں کرتی تھی۔ گزرے ہُوئے دو برسوں میں راشد کی ماں دو تین دفعہ بیمار ہوئی تھی تو بھی ناہید نے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا نہ اُس کی ماں کے قریب گئی تھی۔ وہ یہی ظاہر کرتی رہی کہ وہ شہزادی ہے اور وہ نوکرانیوں سے کام کرانے کی عادی ہے۔

یہ باتیں یاد کرتے کرتے راشد کو یاد آیا کہ ناہید نے چند مرتبہ کچھ ایسی باتیں کی تھیں جن کا مطلب یہ تھا کہ چلو میری ماں کے پاس چل کے رہو۔ وہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ راشد کو کچھ اور باتیں بھی یاد آنے لگیں جو اُس وقت اُس نے یوں سُن لی تھیں جیسے کوئی شرابی نشے میں ماں بہن کی گالیاں سُن کر بھی مستی میں ہنستا رہتا ہے مگر اب اپنے خالی گھر میں بیٹھ کر وہی باتیں اُس کے دل پر بوجھ بننے لگیں اور اُس پر ناہید کی نیت واضح ہونے لگی۔

ناہید کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ راشد کی ماں اپنے بڑے بیٹے کے پاس چلی گئی ہے۔ ناہید شام کو واپس آگئی اور راشد سے اس طرح ملی جیسے برسوں کی جدائی کے بعد ملی ہو لیکن راشد کا رویّہ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ اُس نے ناہید سے کہا کہ وہ اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اپنی ماں کی خدمت کر کے اُس کا حق ادا کرے گا۔ ناہید نے اُس کی مخالفت نہ کی بلکہ کہا کہ اُس کی ماں کو وہ خود جا کر لے آئے گی۔ غرض ناہید نے اُس کے دل کی باتیں کر کے اُس پر اپنا اثر پھر سے قائم کر لیا اور اُسے راضی کر لیا کہ وہ اُس کی ماں سے مل آئے کیونکہ وہ بے چاری بہت پریشان تھی۔

راشد ناہید کی ماں سے ملنے چلا گیا۔ ناہید کا بھائی معمول کے مطابق گھر نہیں تھا۔ ناہید نے اپنی ماں کو سارا واقعہ سُنا دیا تھا اور یہ بھی کہ راشد نے اپنی ماں اور بہن کی سُن کر اُسے ڈانٹا ہے اور اُس کا غلامانہ رویّہ بالکل بدل گیا ہے۔ ناہید کی ماں نے راشد کو دیکھا تو اُسے گلے لگا لیا۔ اُس کی بلائیں لیں اور اُس کا ماتھا چُوما۔ اُسے وہ کمرے میں لے گئی اور پہلے کی طرح پیار کرنے لگی۔ راشد کی ماں کے متعلق اُس نے راشد کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

راشد نے مجھے سنایا کہ ناہید کی ماں اُسے پیار تو پہلے بھی کرتی تھی اور یہ ماں کا پیار تھا لیکن اُس روز اُس کے پیار کا رنگ اور انداز بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ راشد نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ عورت کسی کی ماں نہیں بلکہ یہ ایک جوان عورت ہے جو تشنگی سے مری جا رہی ہے۔ اُس کی ایک حرکت سے راشد بدک کر بیدار ہو گیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس عورت نے راشد کو پلنگ پر لٹا رکھا تھا۔ راشد پلنگ سے اُٹھا۔ ناہید کی ماں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"آپ میری ماں ہیں" — اُس نے کہا۔

"تم تو پاگل ہو راشد!" — ناہید کی ماں نے کہا — "تم نہیں جانتے۔ تمہیں تو میں نے پسند کیا تھا۔"

راشد نے اُس کی آنکھوں میں خمار اور چہرے کا رنگ سُرخ ہوتے دیکھا تو وہاں سے بھاگ آیا۔ اب اُس نے اپنی ساس کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ اس کے چال چلن کے متعلق لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ غلط نہیں اور ماں بیٹی گھر جوائی بنانے کے لئے اُسے اپنے خوبصورت جال میں پھانس رہی ہیں۔ وہ بدنیّت آدمی نہیں تھا اس لئے اُس کا دماغ ماؤف ہوتا چلا گیا۔ وہ حیران تھا کہ کوئی عورت اس حد تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

گھر آ کر اُس نے ناہید کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ اُس پر خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ اُس کی جذباتی حالت ایسی ہوگئی کہ کبھی چکر آتے اور کبھی اُس کے ہاتھ اس طرح کانپنے لگتے کہ وہ ان پر قابو نہ پا سکتا۔ ناہید اس سے پوچھتی رہی کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہوگیا ہے لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ناہید نے

ایک بار ذرا رُعب سے پوچھا۔

"نکل جاؤ اس گھر سے"۔ راشد نے گرج کر کہا۔ "جاؤ اپنی ماں کے پاس۔"

ناہید ڈر گئی اور اُسی وقت اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ راشد نے اُسے نہ بتایا کہ اُس کی ماں نے اس کے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔ مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے اُس نے کہا — "مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک ساس نے اپنے داماد سے بُری نیت کا اظہار کیا ہے۔ اُسے شک ہوتا تھا کہ اُس نے خواب دیکھا ہے۔ وہ کسی سے بات کرتے ڈرتا اور شرماتا تھا۔"

ناہید کے جانے کے بعد وہ اپنی بہن کے گھر گیا۔ اُسے ساتھ لے کر بڑے بھائی کے گھر گیا اور انہیں بتایا کہ وہ ناہید کو طلاق دے رہا ہے۔ ماں نے اُسے بہت روکا لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی نے اُس کا ساتھ دیا۔ ایک دو سیانے آدمیوں سے مشورہ لے کر راشد نے طلاق لکھی اور ناہید کے گھر چلا گیا۔ اُس نے طلاق نامہ ناہید کی ماں کو الگ لے جا کر دیا۔ ماں بہت تڑپی۔

"میں نے تمہاری بیٹی کو نہیں بتایا کہ تم نے کیا کیا ہے" — راشد نے کہا — "میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ تم خاموشی سے طلاق قبول کر لو۔ تمہاری بیٹی کے تمام زیورات، کپڑے اور سامان تمہارے پاس آ جائے گا۔ حق مہر کا ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ تم نے اپنی بیٹی کو ماں نہیں بننے دیا۔ میں اُسے اپنی داشتہ نہیں بنا سکتا۔"

راشد نے اُسے بہت بُری سنائیں۔ ناہید کی ماں طلاق کا کاغذ لے کر رونے بیٹھ گئی اور راشد اپنے گھر آ گیا۔ میرا خیال ہے کہ ناہید کی ماں تجربہ کار عورت نہیں تھی، ورنہ وہ ہنگامہ بپا کر دیتی کہ یہ دیکھو میرے داماد نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ وہ بیوہ ہے اور اُس کے سر پر کوئی نہیں اور اُس کا داماد اس سے پیسہ بٹورنا چاہتا ہے۔

اس طرح راشد اور ناہید کی علیحدگی ہو گئی۔ راشد نے ناہید کا تمام سامان، زیورات اور کپڑے اُس کے گھر بھجوا دیئے۔ ایک روز ناہید کا بھائی

راشد کے گھر آیا۔ وہ کالج میں پڑھتا تھا لیکن ماں کا پیسہ تباہ کر رہا تھا۔ ماں نے اُسے آوارہ شہزادہ بنا رکھا تھا۔ اُس نے راشد کو دھمکی دی کہ وہ اپنی بہن کے اُجڑ جانے کا انتقام لے گا۔ راشد نے اُسے کہا کہ وہ ضرور انتقام لے لیکن غیرت والے بیٹے پہلے اپنے گھر دیکھ لیا کرتے ہیں کہ اُن کی مائیں بہنیں کیا کر رہی ہیں اور لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ شاید ٹھیک ہی ہو۔ راشد نے اُسے بھی نہ بتایا کہ اُس کی ماں نے کیا کیا ہے۔ ویسے اُس کی تسلّی کر دی اور اُسے ڈرا دھمکا بھی دیا۔

راشد کی ماں، بہن اور اُس کا بھائی اُس کی دوسری شادی کی باتیں کرنے لگے۔ راشد اتنا دل برداشتہ ہُوا کہ اُس نے دوسری شادی سے انکار کر دیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" — اُس نے مجھے یہ سارا پس منظر سناتے ہُوئے کہا — "مجھے اس کا کوئی غم نہیں کہ اتنی خوبصورت بیوی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ افسوس اپنی محبت اور خلوص کا تھا۔ میں محبت کی خاطر اُس کا غلام ہو گیا تھا۔ یہ محبت کا تقاضا تھا کہ اُسے خوش رکھوں اور اُس کی ہر خواہش پوری کروں لیکن اُس نے میری محبت کی قدر نہ کی۔ مجھے ایک تو اپنی محبت کا غم کھاتا رہتا ہے، دوسرا غصّہ ہے جو میں کسی پر نکال نہیں سکتا اور تیسرا یہ خیال پریشان رکھتا ہے کہ ناہید کی ماں کیسی عورت ہے جو خاوند اور بیٹے کی تمیز سے آزاد ہے۔"

راشد کا یہ پس منظر سُن کر میں نے اُسے کہا کہ اُس کے پیٹ کی خرابی کا علاج صرف یہ ہے کہ وہ غم اور غصّے سے نجات حاصل کرے اور ناہید اور اُس کی ماں کو بھول جائے۔ میں نے اُسے لیکچر دیا۔ میں یہی کر سکتا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ وہ اچھی طرح سو نہیں سکتا اور ذہن پریشان رہتا ہے۔ میں نے اُسے ذہنی سکون اور نیند کے لئے دوائی لکھ دی۔ وہ چھ سات روز بعد آیا۔ کہنے لگا کہ اُسے پیٹ کی تکلیف کا خاصا افاقہ ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ ثبوت ہے کہ اُس کے پیٹ کا مرض نفسیاتی ہے۔ اس کے بعد وہ نہ آیا۔

وہ دو اڑھائی سال بعد آیا۔ وہ میرے ذہن سے اُتر چکا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت جوان لڑکی تھی۔ اُس نے اپنا نام راشد بتایا اور اپنی آپ بیتی یاد دلائی۔ مجھے کچھ یاد آگیا۔

"یہ ہے وہ ناہید!"۔۔۔ اُس نے کہا۔ "اب یہ پھر میری بیوی ہے۔"

ناہید نے نظریں جُھکا لیں اور میں حیران ہُوا کہ تحریری طلاق کے بعد یہ اس کی بیوی کیسے بن گئی ہے۔ راشد نے کہا کہ ناہید کو ایسی اندرونی خرابی پیدا ہوگئی ہے کہ اس کے ماں بننے کا امکان نظر نہیں آتا۔ اُس نے مجھے یاد دلایا کہ پہلی بار جب ناہید اُس کی دلہن بن کر آئی تھی تو ماں بننے کی اُمید پیدا ہوگئی تھی لیکن ناہید کی ماں نے اسے کچھ کھلا کر راشد کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ بچے جننے سے جسم خراب ہوجاتا ہے۔

مَیں نے اُسے ایک لیڈی ڈاکٹر کا پتہ دے کر کہا کہ اُس سے معائنہ کرا کے مجھے اُس کی رپورٹ دکھاتے۔ وہ تیسرے چوتھے روز رپورٹ لے کر آیا۔ وہ اکیلا تھا۔ میں نے رپورٹ دیکھ کر اُسے دوائیاں لکھ دیں۔ پرہیز وغیرہ بتایا اور اُس سے پوچھا کہ ناہید کو اُس نے دوبارہ کس طرح بیوی بنا لیا ہے۔ اُس نے ایک اور کہانی سُنادی۔

اُس نے سُنایا کہ دس بارہ دن پہلے کا واقعہ ہے کہ راشد کے محلے کی ایک عورت نے راشد سے رازداری سے کہا کہ ناہید نے اُسے اپنے گھر بلایا ہے اور منت کی ہے کہ خدا کے لئے ذرا سی دیر کے لئے آجاؤ۔ یہ عورت لوگوں کے گھروں میں کام کیا کرتی تھی۔ راشد کے گھر بھی آیا کرتی تھی۔ وہ ویسے ہی ناہید کی ماں کے گھر گئی تھی۔ راشد نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اس عورت نے اُسے کہا کہ وہ رو رو کر اپنا بُرا حال کر رہی ہے۔ راشد نے دو اڑھائی سال گزر جانے کے باوجود شادی نہیں کی تھی۔ اُس نے سُنا تھا کہ ناہید کی شادی طلاق کے چوتھے پانچویں مہینے ہوگئی تھی۔ اس سے زیادہ راشد کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

راشد کے دل میں ناہید کی محبت جاگ اُٹھی۔ وہ اپنی ماں کو بتائے بغیر

شام کے بعد ناہید سے ملنے چلا گیا۔ دروازہ ناہید نے کھولا۔ راشد کو دیکھ کر اُس کے آنسو نکل آئے۔ یہی حالت ناہید کی ماں کی ہُوئی۔ ماں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ناہید اُسے ایک کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ ناہید کا چہرہ اُترا ہُوا تھا اور اُس کے آنسو جاری تھے۔ راشد نے اُسے کہا کہ اُس کی تو شادی ہوگئی تھی، اب وہ رو کیوں رہی ہے؟

ناہید نے اُٹھ کر اُس کے پاؤں پکڑ لئے اور بولی۔۔۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو اور نکاح پڑھا کر مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں نے دوسرے خاوند سے بڑی مشکل سے طلاق لی ہے۔"

ناہید نے اپنی دوسری شادی کا قصہ یُوں سنایا کہ راشد نے اُسے طلاق دے دی تو اُس کی ماں اور بھائی نے کہا کہ اُس کی شادی بہت جلدی ہوجانی چاہئے تاکہ راشد کے منہ پر ہاتھ پھیرا جا سکے۔ ناہید خوبصورت تھی لیکن رشتے کے لئے کوئی نہیں آتا تھا کیونکہ اُسے طلاق ہوچکی تھی۔ لوگ راشد کو اور اُس کے خاندان کو بھی جانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو لڑکی اتنے شریف خاوند اور اتنے اچھے خاندان میں نہیں رہ سکی وہ کہیں بھی خوش نہیں رہے گی۔ ہمارے معاشرے میں کہانیاں فوراً گھڑ لی جاتی ہیں۔ ناہید کے ساتھ بھی چار دیواری کی دنیا نے یہی سلوک کیا۔

ناہید کا بھائی ماں کا پیسہ اُڑانے کے لئے کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ دراصل کالج جاتا تھا، پڑھتا کم ہی تھا۔ اُس کے کالج کا ایک لیکچرار تھا جس کی دوستی ناہید کے بھائی کے ساتھ تھی۔ ایک ہمارے وقتوں کے پروفیسر وغیرہ ہوتے تھے جن میں وقار تھا اور اُن میں اُستادوں والا رعب ہوتا تھا۔ سٹوڈنٹ ان کا احترام کرتے تھے۔ اب میں نے یہ وقت دیکھا کہ لیکچراروں نے آوارہ اور شہزادے قسم کے سٹوڈنٹس سے دوستیاں لگا رکھی ہیں۔ اُستاد اور شاگرد والا احترام ختم ہوگیا ہے۔ تعلیم برائے نام رہ گئی ہے۔ اب کالجوں کی جو باتیں سُنتا رہتا ہوں وہ دل کو تکلیف دیتی ہیں۔

وہ لیکچرار بھی کوئی ایسا ہی تھا جو ناہید کے بھائی کا دوست تھا۔ وہ

ابھی جوان تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ اسی لڑکے جیسے لڑکوں کے ساتھ دوستی رکھتا اور ان سے کھاتا پیتا تھا۔ اُس نے لڑکوں کو یہ تاثر دے رکھا تھا کہ وہ ملتان کے امیر کبیر خاندان کا فرد ہے۔ ناہید کے بھائی نے اُس کے ساتھ اپنی بہن کا ذکر کیا کہ اُسے طلاق ہوگئی ہے اور اُس کے رشتے کی تلاش ہے۔

لکچرار نے اُسے بتایا کہ وہ خود کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں ہے جس کا خاندان بہت بڑا نہ ہو۔ اُس نے کہا کہ اُسے اپنے خاندان سے بہت رشتے ملتے ہیں لیکن وہ برادریوں کی بک بک سے آزاد پُرسکون ازدواجی زندگی کا خواہشمند ہے۔

ناہید کے بھائی نے اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ بات کی پھر اپنی ماں کے ساتھ لکچرار کا ذکر کیا۔ لکچرار نے ناہید کے بھائی کے دوستوں سے کہا کہ وہ ناہید کا رشتہ اسے دلا دیں۔ ناہید کی ماں نے لکچرار کو اپنے ہاں بلایا اور رشتہ طے ہوگیا۔ ناہید کو بھی لکچرار پسند آگیا۔ اُس میں ماں بیٹی نے یہ خوبی دیکھی کہ اُس نے کہا تھا کہ وہ انہی کے پاس رہے گا اور اپنے خاندان کے کسی بھی فرد کو شادی پر نہیں بلائے گا۔

ناہید کی ماں کو گھر داماد کی خواہش تھی۔ اُس نے نہایت خاموشی سے ناہید کی شادی اس لکچرار کے ساتھ کر دی اور لکچرار وہیں رہنے لگا۔ چھ مہینے تو ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ اس کے بعد لکچرار نے اپنے ہاتھ دکھانے شروع کر دیئے۔ مثلاً سب سے پہلے اُس نے ناہید کی ماں سے کہا کہ وہ اپنے خاندان سے کٹ چکا ہے، اس لئے وہ لوگ اُسے پریشان کر رہے ہیں۔ اُسے تین ہزار روپیہ چاہیئے جو وہ ایک قرض کی ادائیگی کے لئے بھیجنا چاہتا ہے۔

ناہید کی ماں نے اُسے تین ہزار روپیہ دے دیا۔ اس کے بعد اُس کی کوئی نہ کوئی فرمائش ناہید کی ماں کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح پڑنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ناہید کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ایک راشد تھا جو غلاموں کی طرح ناہید کے حضور حاضر رہتا تھا اور ایک یہ خاوند ملا جو ناہید سے نوکرانیوں کی طرح خدمت کراتا تھا۔

ایک سال بعد ناہید کے سونے کے دو کڑے گم ہوگئے۔ بہت

تلاش کئے، نہ ملے۔ عجیب بات تھی کہ باقی زیورات پڑے رہے، صرف کڑے چوری ہوئے۔ ایک مہینہ بعد ناہید کی ماں کے اٹیچی کیس سے اُس کی دو انگوٹھیاں غائب ہوگئیں۔ اس طرح ایک مہینے کے وقفے سے کبھی کچھ رقم غائب ہو جاتی کبھی سونے کا کوئی زیور غائب ہو جاتا۔

لکچرار نے ناہید کی ماں سے کہا کہ گھر میں قرآن ختم کراؤ۔ یہ چوریاں کوئی انسان نہیں کر رہا۔ یہ کوئی اور گڑبڑ ہے۔ اُس نے ایسی باتیں کیں کہ ناہید اور اُس کی ماں مان گئیں کہ یہ کسی نے کالے علم کا تعویذ کر دیا ہے یا جنات چوریاں کر رہے ہیں۔ لکچرار باتیں بنانا اور اپنا اثر پیدا کرنا جانتا تھا۔ اُس نے ایک مولوی یا عامل کو ساتھ لیا اور ختم قرآن کرا کے اُس سے کہلوایا کہ کسی دشمن نے تعویذ کر رکھے ہیں۔

ناہید اس سے تنگ آگئی تھی۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ کے روتی رہتی۔ ناہید کا بھائی اُس کی کوئی شکایت نہیں سنتا تھا۔ کہتا تھا کہ تم اپنی عادتوں کی وجہ سے ایک خاوند سے طلاق لے چکی ہو۔ اب اتنے اچھے خاوند سے بھی طلاق لینا چاہتی ہو۔ وہ لکچرار کی بہت تعریفیں کرتا تھا۔ ناہید میں اندرونی نقص پیدا ہوگیا تھا اس لئے وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ خاوند اُس کا علاج نہیں کرا رہا تھا۔ مختصر یہ کہ لکچرار نے انہیں خوب کھایا۔

ازدواجی زندگی کا دوسرا سال ختم ہونے کو تھا۔ ایک روز ناہید کی ماں کے ہاں ایک جوان عورت آئی۔ اُس کے ساتھ دو بچے تھے۔ وہ کوئی اجنبی تھی۔ اُس نے اپنا تعارف یُوں کرایا کہ وہ ملتان سے آئی ہے اور وہ ناہید کے خاوند لکچرار کی بیوی ہے۔ وہ اُس کے کالج گئی تھی۔ کسی نے اُسے ناہید کے گھر کا پتہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وہاں رہتا ہے۔ وہ گھر پہنچ گئی۔

اُس نے لکچرار کے متعلق بتایا کہ معمولی سے خاندان کا آدمی ہے اور بہت چالاک۔ مل مِلا کر پاس ہوتا رہا اور اس نے ایم۔ ایس۔ سی کر لی پھر لکچرار لگ گیا۔ اس عورت کی شادی اس لکچرار کے ساتھ ہوگئی لیکن اس کا رویہ بہت بُرا نکلا۔ اس نے صرف ایک بار بیوی کو چھ سات مہینے اپنے ساتھ رکھا لیکن بیوی سے

یہی کہتا رہتا کہ اپنے ماں باپ سے پیسے منگواؤ۔ وہ اپنی کوئی نہ کوئی مشکل بتا
دیتا۔ بیوی بھی تنگ آگئی اور اس کے ماں باپ بھی۔ لیکچرار چھٹیاں ملتان اپنی
بیوی کے پاس گزارتا تھا۔

دو بچے پیدا ہوئے۔ پھر لیکچرار نے گھر جانا چھوڑ دیا۔ اُس نے
بیوی اور اُس کے ماں باپ کے خلاف بڑی سنگین اور گھٹیا شکایتیں پیدا
کر لی تھیں۔ اب انہیں لیکچرار کی شادی کا علم اس طرح ہوا کہ اس کا سُسر
یہاں آیا۔ لیکچرار اُسے کالج میں نہ ملا۔ وہ چھپ گیا ہوگا۔ اس کے بعد اُس
کی بیوی اپنے بچوں کو ساتھ لے کر آگئی اور اُسے اپنے خاوند کا سُراغ
مل گیا۔

ناہید کی ماں اور ناہید کی جو حالت ہوتی ہوگی، وہ تصوّر میں لائی
جا سکتی ہے۔ اُنہوں نے اس عورت کو گھر بٹھا رکھا۔ وہ انہیں بتاتی رہی
کہ لیکچرار کیسا نوسرباز، اداکار اور فریب کار ہے۔

لیکچرار اور ناہید کا بھائی اکٹھے کالج سے واپس آتے۔ اپنی پہلی بیوی
اور بچوں کو دیکھ کر لیکچرار بھونچکا رہ گیا۔ آدمی اُستاد تھا، فوراً سنبھل گیا اور بیوی
پر برس پڑا۔ کہنے لگا کہ اس عورت کو میں بدچلنی کی وجہ سے طلاق دے چکا ہوں۔
یہ اتنی بدمعاش ہے کہ مجھے ذلیل کرنے کے لئے یہاں آگئی ہے۔ اسے میرے
دشمنوں نے بھیجا ہے۔

یہ عورت مظلوم اور زخم خوردہ تھی۔ وہ جب بولی تو لیکچرار کی اُستادی
ٹھنڈی ہوگئی۔ عورت نے گِن گِن کر سنانی شروع کر دیں۔ اُس نے کہا کہ میں تو
اپنی ساری برادری کو ساتھ لاؤں گی۔

ناہید کے بھائی کا جوان خون جوش میں آگیا۔ وہ چپکے سے گھر سے
کھسک گیا۔ واپس گھنٹے بعد آیا۔ اُس کے ساتھ تین نوجوان لڑکے تھے۔ وہ لیکچرار
کو الگ کمرے میں لے گئے اور ان چاروں نے چاقو نکال لئے۔ اُس کے
آگے کاغذ اور پین رکھ کر کہا کہ ناہید کی طلاق لکھو۔ اُس نے کہا کہ وہ ناہید کو
طلاق نہیں دے گا۔ پہلی بیوی کو طلاق لکھ دیتا ہے۔ ان چاروں لڑکوں نے

اُسے خوب مارا پیٹا پھر اُسے قتل کی دھمکی دے کر طلاق لکھوائی۔ اُنہوں
نے اُسے اتنا ڈرایا کہ اُس سے یہ بھی منوا لیا کہ ناہید اور اُس کی ماں
کے زیورات اور پیسے وہی چُراتا رہا ہے۔ یہ زیورات اُس نے بیچ
ڈالے تھے۔

طلاق لکھوا کر لڑکوں نے اُسے اُس کی پہلی بیوی کے ساتھ گھر سے
نکال دیا۔

اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا تھا بلکہ ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔

ناہید کو دوسری بار طلاق ہو گئی تھی۔ راشد کے ساتھ بھی ناہید نے دو ہی سال
گزارے تھے۔ اب ماں بیٹی سوائے ماتم کرنے کے کر ہی کیا سکتی تھیں۔ لوگوں
کی باتوں کا خوف الگ تھا۔ ماں بیٹی تماشہ بن گئی تھیں۔ فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں
آتا تھا۔ اس اندھیرے میں ناہید کو راشد کی محبت یاد آتی۔ اُسے معلوم تھا کہ
راشد نے دوسری شادی نہیں کی۔ ناہید کو یہ بھی یقین تھا کہ راشد کے
دل میں اُس کی محبت تھی مگر اُسے یہ یقین نہیں تھا کہ راشد اُسے قبول کر
لے گا۔ وہ پچھتانے لگی اور اُس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے ماں
کے ساتھ راشد کی بات کی تو ماں نے کہا کہ اُس کے ساتھ ہم نے کون سا
اچھا سلوک کیا ہے کہ وہ ہماری مشکل آسان کرنے آجاتے گا۔

ناہید اکیلی کمرے میں بیٹھی روتی اور سوچتی رہی۔ اُسے اپنا سلوک
یاد آتا تھا جو اُس نے راشد کے ساتھ کیا تھا لیکن اُس کے دل سے آواز
آتی تھی کہ راشد اُسے پناہ میں لے لے گا۔ وہ راشد کے پاس فوراً اس لئے
پہنچ جانے کی سوچ رہی تھی کہ وہ جتنا لمبا عرصہ خاوند کے بغیر رہے گی
لوگ اُسے بدنام کرتے رہیں گے۔ لوگوں کو تو پھر بھی باتیں کرنی ہی تھیں
لیکن خاوند سر پر ہو تو عورت کو حوصلہ رہتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اُسے
راشد کی محبت کی قدر و قیمت اب معلوم ہوئی تھی جب اُسے ایک فریبی
خاوند محبت کا دھوکہ دے گیا تھا۔ مٹھاس کی قدر تھوڑی سی کڑواہٹ پی
کر ہوتی ہے۔

ناہید کو پہلی بار محسوس ہُوا کہ خُدا کی ذات بھی ہے اور اُس کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہِل سکتا۔ اُس نے نہا کر کمرہ بند کر لیا اور نفل پڑھے۔ اس دوران روتی رہی پھر اُس نے روتے ہوئے دعا کی۔ اپنی غلطیوں کی خُدا سے معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ عاجز اور مسکین بن کر باقی زندگی گزارے گی۔

اس سے کوئی ایک گھنٹہ بعد راشد کے محلّے کی ایک عورت اتفاق سے اُس کے ہاں جا نکلی۔ ناہید نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ راشد کو بلاتے گی۔ ماں نے کہا کہ بلا کے دیکھ لو۔ وہ نہیں آئے گا۔ اُس نے اس عورت کو پانچ روپے دیئے اور اُسے راشد کے نام زبانی پیغام دیا۔

راشد اُس کے پاس پہنچ گیا۔ ناہید نے اُسے اپنی دوسری شادی کی ہر ایک بات سنا دی۔ راشد اُسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ اُس نے ناہید کو اس طرح روتے اور بے حال ہوتے دیکھا تو اُس نے کہا کہ ناہید چاہے تو وہ اس لکچرار کا ایسا حال کر دے کہ وہ مرے بھی نہیں اور زندہ بھی نہ رہے اور ایک دن یہ لکچرار اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لے۔

راشد نے اپنی ماں، بہن اور بڑے بھائی کو راضی کر لیا اور ایک روز انہیں ساتھ لے جا کر وہ ناہید کو بیاہ لایا۔ لوگوں کے لئے یہ بڑا عجیب تماشہ تھا لیکن راشد اور ناہید نے کان بند کر لئے۔ راشد کو اب وہ ناہید مل گئی جو عاجز اور مسکین تھی۔ اُس نے خُدا سے جو عہد کیا تھا وہ چند دِنوں میں پُورا کر دکھایا۔

ناہید کی اندرونی خرابی کے علاج کے دوران ایک روز میں نے ناہید کو بتایا کہ میں اُس کی اور راشد کی ساری کہانی سے واقف ہُوں۔ اُس نے میرا رویہ اور طریقۂ علاج دیکھ لیا۔ راشد نے بھی شاید اُسے کچھ بتایا ہوگا۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔ اُس کا ایک جُملہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا ــ "وہ ناہید مر گئی ہے۔ اُسے مار کر میں نے خُدا کو راضی کیا ہے۔ خُدا بن سنور کر رہنے اور دوسروں کو اپنا غلام بنا کر رکھنے میں نہیں ملتا۔ میں نے خُدا کی ذات سے بیگانہ رہنے کی سزا بھگت لی ہے۔"

راشد نے اپنے پیٹ کی تکلیفوں کے متعلق بتایا کہ میرا علاج چھوڑ کر اُس نے تین حکیموں کا علاج کرایا مگر ذرا سا بھی افاقہ نہ ہُوا۔ اب ناہید کے ساتھ دوبارہ شادی کر کے اور اُس میں انقلاب دیکھ کر اُس کا پیٹ بالکل ٹھیک ہو گیا۔

چار دیواری کی دنیا کی یہ کہانی یہیں پر ختم ہو جانی چاہیئے تھی لیکن یہ کچھ اور آگے چلی گئی۔ ناہید اپنے علاج کے لئے کبھی راشد کے ساتھ آتی تھی کبھی راشد اکیلا آتا اور دوائی لے جاتا۔ ایک روز دونوں آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ناہید کی ماں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ اُس کی صحت اچانک گِر گئی ہے۔ بھوک اور نیند میں بھی گڑبڑ ہو گئی ہے اور وہ بے چینی زیادہ محسوس کرتی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ اُسے لے آئیں۔

وہ ان کے ساتھ آگئی۔ میں نے اُسے تندرستی کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر بڑھاپے کے آثار تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ اُس کی یہ حالت دو اڑھائی برسوں میں ہوئی ہے ورنہ اسے کوئی بوڑھی نہیں سمجھتا تھا۔ بڑھاپے میں بھی وہ خوبصورت لگتی تھی۔ اُس نے اپنی تکلیفیں بتائیں۔ میں سمجھا کہ یہ عمر کے اُس حصّے میں ذرا جلدی داخل ہو گئی ہے جس میں ہر عورت کے اندر تبدیلی رونما ہوتی ہے اور اُس میں بچے پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسے MENOPAUSE کہتے ہیں۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ بعض عورتوں پر اس کے اثرات اچھے نہیں ہوتے۔ وہ DEPRESSION میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس کا کچھ نہ کچھ علاج ہو جاتا ہے۔

میں نے اُسے دوائیاں دیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نیند اور ذہنی سکون کی گولیوں کا اُس پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ میں اُس کی علامات کی اور زیادہ گہرائی میں گیا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ یہ ابھی عمر کے اُس حصے میں نہیں پہنچی۔ اسے کوئی اور تکلیف تھی۔ اس کے مطابق دوائیاں بدل کر دیں۔ ایک ہفتے بعد اُسے دیکھا۔ اُس کی حالت اگر زیادہ نہیں بگڑی تھی تو بہتر بھی نہیں

ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں اُس کا پیسہ اور اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔
علاج کے دوران اس کے ساتھ میں نے بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ راشد
اس کے متعلق مجھے سب کچھ بتا چکا تھا۔ میں اب یہ سمجھنے لگا کہ اس عورت
کو بیٹی کا غم کھا رہا ہے۔ یہ بات معمولی نہیں تھی کہ اس کی بیٹی کو چار سال کے عرصے
میں دو بار طلاق ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں لوگ کیا کیا قصّے گھڑتے ہوں گے اور
وہ اس کے کانوں تک بھی پہنچتے ہوں گے۔ میں نے ایک روز اُسے کہا کہ
میں اُس کے اور اُس کی بیٹی کے سارے حالات اور واقعات سے واقف
ہوں اور اُسے اس کے سوا کوئی بیماری نہیں کہ اُس کے ذہن پر بوجھ ہے
جو اُسے اتار دینا چاہیئے کیونکہ راشد اُس کی بیٹی کو چاہتا ہے اور اُس کی
بیٹی نے اپنا رویہ اس طرح بدل لیا ہے کہ اب راشد کے ساتھ اس کی ناراضگی
نہیں ہو گی۔

اُس روز کے بعد اُس نے میرے پاس باقاعدگی سے آکر اور دل کی باتیں
کرنا شروع کر دیں۔ ابھی ڈاکٹروں کے ہاں مریضوں کا یہ رَش شروع نہیں ہُوا
تھا جو آج کل ہے۔ مجھے ہر مریض کے لئے بہت وقت مل جاتا تھا۔ ناہید کی
ماں کی حالت بہتر نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی تیزی سے اُس کی صحت گرتی جا
رہی تھی۔ میں نے اُس کے خون، پیشاب، تھوک اور پاخانے کا معائنہ کرا کے
دیکھ لیا۔ اُس کے سینے کا ایکسرے بھی کرا کے دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔

ایک روز میں نے اُسے دوپہر کا وقت دیا جب مریضوں سے فراغت
ہو جاتی تھی۔ وہ آئی تو میں نے اُسے الگ کمرے میں بٹھا لیا۔

"تم کہتی ہو کہ بیٹی کی طرف سے مطمئن ہوں" — میں نے اُسے کہا —
"لوگوں کی باتوں کی بھی تمہیں پرواہ نہیں۔ تم نے یہ بھی کبھی نہیں کہا کہ تمہارا
اکلوتا بیٹا آوارہ ہو گیا ہے اور تمہیں اس کا روگ لگا ہُوا ہے۔ اس کے سوا
اور کیا ہو سکتا ہے .... مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟"

"ہاں ڈاکٹر صاحب!" — اُس نے کہا — "میں ایسی بات چھپا رہی ہوں
جو زبان پر آتی ہے تو زبان جلنے لگتی ہے۔ میں اپنا علاج نہیں کرانا چاہتی۔
راشد اور ناہید پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ پہلے روز وہی دونوں مجھے آپ

کے پاس زبردستی لاتے تھے۔"

میں نے بڑی ہی مشکل سے اُس کے سینے سے وہ روگ نکالا جو
اُسے کھا رہا تھا اور جسے وہ زبان پر لانے سے ڈرتی تھی۔ ایک بار اُس کی زبان
کھلی تو میں نے اُس سے ساری بات کہلوالی۔ ذرا غور فرمائیے کہ ضمیر پر جرم کا
بوجھ انسان کا کیا حال کر دیتا ہے۔ اُس نے راز کی وہی بات بتائی جو راشد مجھے
دو سال پہلے سنا چکا تھا۔

"میں بدعورت نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب!" — اُس نے کہا — "مگر ایک
بار شیطان نے مجھے ایسا اندھا کیا کہ میں نے اپنے داماد پر بُری نیت کا
اظہار کیا۔"

مجھے یہ سارا واقعہ معلوم تھا لیکن میں نے اُسے نہ بتایا کہ راشد مجھے بتا چکا
ہے۔ میں نے ناہید کی ماں سے کہا کہ وہ مجھے سارا واقعہ سنائے۔ اُس نے
سُنا دیا۔ جھوٹ نہ بولا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس نے تو راشد کو بیٹا نہ سمجھا لیکن
راشد نے اُسے ماں سمجھا اور وہ بھاگ گیا۔ پھر اُس نے ناہید کو طلاق دے دی۔

"اگر راشد گھٹیا کردار کا آدمی ہوتا تو ناہید کو یہ طعنہ ضرور دیتا کہ تمہاری
ماں بدکار ہے" — اُس نے کہا — "میں نے ناہید کی شادی اُس بدمعاش
لچرار کے ساتھ کر دی۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہُوا۔ پھر ناہید کی اُس سے طلاق
لکھوائی تو مجھے بہت افسوس ہُوا مگر ناہید نے راشد کو بلا لیا اور راشد نے اُسے
اپنے عقد میں لے لیا اور اُس نے مجھے کہا کہ میرے ساتھ شریفوں کی طرح
رہو گی تو اپنی جان بھی تمہاری عزت پر قربان کر دوں گا۔ اس سے مجھے دھکا
سا لگا۔ میں نے اپنی صرف نیت خراب کی تھی، گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تھا
لیکن راشد کا خلوص اور شرافت دیکھ کر میرے اندر پچھتاوا پیدا ہو گیا۔ اُس
روز سے میری بھوک اور نیند ماری گئی ہے اور میں اپنے اندر کوئی روگ
محسوس کرتی ہوں جسے میں بیان نہیں کر سکتی۔"

میں اُس کا روگ سمجھ گیا۔ وہ بُرے چال چلن کی عورت نہیں تھی۔ اُس
کی زندگی سے گناہ کا گزر کبھی نہیں ہُوا تھا۔ انسان بڑی کمزور چیز ہے۔ وہ بیوہ

تھی۔ ایک خوبرو اور دل کش جسم والے آدمی کو دیکھ کر بھٹک گئی۔ یہ گناہ خیالوں اور نیّت تک ہی رہا۔ عملاً آگے نہ بڑھا مگر ضمیر نے اُسے پکڑ لیا اور اب وہ لاشعوری طور پر اپنے آپ کو سزا دے رہی تھی۔

میں نفسیات کا ڈاکٹر نہیں ہوں۔ جو کچھ جانتا تھا وہ اس پر آزمایا۔ وعظ اور لیکچر دیتے۔ وہ میرے پاس آتی رہی چونکہ میں اس کا رازدار ہو گیا تھا اس لئے وہ غبار میرے آگے نکال دیتی تھی۔ اس سے اُسے خاصا افاقہ ہُوا۔ اُس کی صحت بہتر ہونے لگی لیکن اُسے کبھی کبھی دورہ پڑ جاتا تھا۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ میں نے اُسے صوم وصلوٰۃ کی طرف لگا دیا تھا۔ پھر اُسے مشورہ دیا کہ حج پر چلی جائے اور خانہ کعبہ میں اپنی روح کے سکون کے لئے دعا کرے۔

وہ اُسی سال حج پر چلی گئی اور واپس آکر میرے پاس آئی۔ میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتا کہ میں نے اُس میں کیسا انقلاب دیکھا۔ اُس کے چہرے پر رونق تھی اور اُس کی باتوں میں اُداسی کا نام ونشان نہیں تھا۔ کہنے لگی۔۔۔ "خُدا نے مجھے بخش دیا ہے۔"
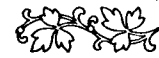
ایک قرض جو ادا ہو گیا

ڈاکٹر ممتاز حسین بھٹی سے ملاقات اُن دنوں میں ہوتی جب جشنِ آزادی کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے اُداس نظر آئے۔ کہنے لگے ــ "۱۴ اگست کے روز لوگ خوشیاں منا رہے ہوں گے۔ آزادی کی جتنی بھی خوشیاں مناؤ کم ہیں لیکن بے شمار گھر ایسے ہیں جو خوشیوں کے ساتھ ماتم بھی کر رہے ہوں گے۔ میں اگست کے مہینے میں اسی طرح اُداس ہو جایا کرتا ہوں۔"

آزادی کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ــ "میں آج آپ کو ایک نفسیاتی مریض کا کیس سناؤں گا جس کا تعلق ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے ساتھ ہے۔ ہندوستان سے، خصوصاً مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کی پاکستان میں آمد تاریخ کی ایک بہت بڑی اور بڑی ہی بھیانک ہجرت ہے۔ بعض قوموں نے ہجرت کی ہے لیکن مہاجروں کے قافلے ایک ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک کو خیریت اور اطمینان سے چلے گئے۔ سفر کی مشکلات کے سوا انہیں اور کوئی خطرہ پیش نہ آیا۔ ہندوستان سے پاکستان کو مسلمانوں کی ہجرت کے متعلق باہر کے ملکوں کے اخباری رپورٹروں نے لکھا تھا کہ مہاجروں کی اتنی زیادہ قتل وغارت اور اس بھیانک ہجرت کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر بھٹی صاحب نے مجھے وہی رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سنائے جو آپ "حکایت" میں کہانیوں اور مضامین کی صورت میں پڑھتے رہتے ہیں۔

"بہت سے مہاجرین زخمی تھے" ڈاکٹر صاحب نے کہا ــ "جسم کے زخم

توچند دنوں یا ایک آدھ مہینے میں ٹھیک ہو گئے تھے مگر ہر ایک مہاجر جو جسمانی طور پر زخمی تھا یا زخمی نہیں تھا وہ ایسا زخم کھا کر آیا تھا جسے کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ کسی نے محسوس ہی نہ کیا۔ یہ زخم خراب ہوتا رہا ہے اور معاشرے کا ناسور بن گیا ہے... میرے پاس کچھ کیس آتے تھے لیکن ایک کیس ایسا تھا جو مجھے بہت یاد آ رہا ہے۔ میں آپ کو یہی سنا دیتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے سنایا کہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں تیس سال کی عمر کا ایک آدمی ان کے ہاں گیا اور مرض یہ بتایا کہ اُسے نیند نہیں آتی۔ اُس نے اپنا نام نواز بتایا۔ نیند نہ آنا کوئی بیماری نہیں۔ یہ کسی بیماری کی علامت ہوتی ہے۔ نواز سے ڈاکٹر صاحب نے کافی کچھ پوچھا۔ اس نے ایک ہی شکایت کی کہ نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے نیند کی ایک دوائی دے دی۔ آٹھ دس روز بعد وہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ دوائی کا اثر اچھا نہیں ہُوا بُرا ہی ہُوا ہے۔ نیند س سے نہیں آتی۔ اُلٹا تلخی اور بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اُسے ایک بڑی اچھی دوائی لکھ دی۔ دس بارہ دنوں کے استعمال کے بعد مریض نے آ کر یہ رپورٹ دی کہ دو راتیں نیند آئی پھر یہ گولیاں ناکام ہو گئیں۔ صرف غنودگی دیتی تھیں۔ ایک رات اُس نے دو اور اگلی رات تین گولیاں کھائیں، تب اُسے نیند آئی۔ وہ پوری شیشی ختم کر کے آیا۔ ڈاکٹر بھٹی کہتے ہیں کہ نواز نے مایوسی اور احتجاج کے لہجے میں کہا — "میں کسی روز یہ پوری شیشی کی گولیاں ایک ہی بار کھاؤں گا۔"

ڈاکٹر بھٹی کے خیال میں نواز کی بے خوابی کا کوئی ایک باعث تھا جو نفسیاتی ہی ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ اکثر بیماریوں کا تعلق ذہن کے ساتھ ہوتا ہے۔ آج کل زیادہ تر جسمانی امراض نفسیاتی خلفشار کا نتیجہ ہیں مگر ڈاکٹر انہیں دوائیاں دیتے چلے جا رہے ہیں۔ مرض کا نفسیاتی ڈھانچہ نہیں دیکھا جاتا۔ ڈاکٹر بھٹی دیکھ رہے تھے کہ نواز کا چہرہ مُرجھاتا چلا جا رہا ہے اور وہ جب بات کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے جیسے اُس کا دماغ اُس کا ساتھ نہیں دے رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے کہا کہ وہ گولیوں سے نیند حاصل کرنے کی کوشش

ترک کر دے، ورنہ وہ گولیوں کا عادی ہو جائے گا اور اُسے حاصل کچھ نہ ہو گا، اور وہ جب تک یہ نہیں بتائے گا کہ اُسے کیا غم کھا رہا ہے، اُس کا علاج نہیں ہو سکے گا۔

"میرا غم ایسا ہے جو میں کسی کو بتا نہیں سکتا" — نواز نے کہا — "میں خود جانتا ہوں کہ یہی غم مجھے سونے نہیں دیتا اور یہ غم ایسا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنے دلائل سے اُسے آمادہ کر لیا کہ وہ دل کی بات بتا دے۔ اُس نے بتایا کہ وہ مشرقی پنجاب کا مہاجر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے نواز کا کیس سناتے ہوئے کہا کہ انہیں پہلے ہی خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اس شخص کے ذہن اور اعصاب پر ہجرت کی ہولناکی سوار ہے۔ انہوں نے کیس سنانے سے پہلے اس کا پس منظر سنانا ضروری سمجھا۔ کہنے لگے کہ جرائم کا ارتکاب تو انسان شروع سے کر رہا ہے لیکن دوسری جنگِ عظیم ۴۵-۱۹۳۹ء کے بعد یورپ اور برطانیہ میں جرائم میں بے پناہ اضافہ ہُوا اور جرائم کی نوعیت بھی بدل گئی۔ ڈاکہ زنی، رہزنی اور قتل کی وارداتیں عام ہو گئیں اور جنسی بے راہروی بھی عام ہو گئی۔ ذہنی امراض میں بھی اضافہ ہو گیا۔

ترقی یافتہ ممالک میں یہ خوبی ہے کہ وہاں اعداد و شمار فراہم کرنے اور جائزے لینے کا رواج موجود ہے۔ نفسیات اور معاشرتی علوم کے ماہرین نے مجرموں اور ذہنی مریضوں کا تجزیہ کیا تو انہوں نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں لکھا کہ یہ وہ نسل ہے جو جنگ کی ہولناکی میں پیدا ہوئی۔ مسلسل پانچ چھ سال اس پر بم گرتے رہے۔ ان کے خاندانوں کے افراد بموں سے یوں مرے کہ لاشیں مکانوں کے ملبے تلے کچلی مسلی گئیں یا جسموں کے اعضا کٹ کر بکھر گئے۔ انہوں نے بھوک دیکھی اور وہ موت کے مسلسل خوف میں رہے۔ بعض کے لئے چھپنے کی جگہ بھی نہ رہی۔

جن علاقوں پر دوسرے ملکوں کی فوجوں کا قبضہ ہو گیا وہ پہلے طیاروں، توپوں اور ٹینکوں سے تباہ ہوتے تھے۔ رہی سہی کسر فاتح فوجوں

نے پوری کر دی۔ یہ فوجیں آبروریزی کو اپنا حق سمجھتی تھیں۔ جنگ تو ختم ہو گئی مگر برسوں تک یہ لوگ بے گھر رہے اور مویشیوں کی طرح خوراک کی تلاش میں زندگی بسر کرتے رہے۔ ایسے حالات کے اثرات بہت ہی بُرے ہوتے ہیں جو تمام عمر ذہن لاشعور میں موجود رہتے ہیں اور انسان ان کے آسیب میں گرفتار رہتے ہوتے غیر انسانی زندگی گذارتا ہے۔ ایسے لوگوں میں رحم اور محبت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ وہ مجرمانہ سرگرمیوں سے لطف اٹھاتے ہیں۔

ان میں سے جو شریفانہ زندگی میں رواں دواں ہو گئے، اُن کے مزاجوں پر جنگ کے اثرات قائم رہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنی اولاد کے لئے مصیبت بنے رہے۔ ایسے بدمزاج والدین کی اولاد نارمل نہیں رہتی۔ چنانچہ اولاد نے بے راہ روی میں سکون پانا شروع کر دیا اور یورپی معاشرہ خطرناک مجرموں سے بھرتا چلا گیا۔

یہ ہے ہماری ۱۹۴۷ء کی ہجرت کا وہ پہلو جو ڈاکٹر بھٹی صاحب نے مجھے سمجھایا۔ کہنے لگے کہ مشرقی پنجاب میں چھوٹے چھوٹے بچے اور کمسن لڑکے اور لڑکیاں پُرامن زندگی گزار رہی تھیں۔ اُن پر اچانک ہندو اور سکھ ٹوٹ پڑے۔ اُن کے گھروں کو آگ لگادی گئی۔ اُن کے گھر والوں کو قتل کیا گیا۔ لڑکیوں کی آبروریزی ہوتی اور جو بچ گئے انہیں اپنے گھروں سے بھاگنا پڑا۔ جو لوگ مہاجر نہیں ہیں، وہ ذرا تصور میں لائیں کہ اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا، انہیں صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ۔ یہ لوگ اس تصور سے ہی کانپنے لگ جائیں گے۔ پھر تصور میں لائیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے پاپیادہ میلوں کی ایسی مسافت طے کرکے آئے کہ اُن کا کشت و خون ہوتا رہا۔ اُن کے سامنے اُن کے عزیز، اُن کے دوست، اُن کے ہجولی اور اُن کے جان پہچان والے کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ بھوک، پیاس اور خوف میں وہ پاکستان پہنچے۔

اُن کی تعداد چند سو یا چند ہزار نہیں تھی، لاکھوں تھی۔ یہاں آکر انہیں

وہ پناہ نہ ملی جس کی انہیں توقع تھی۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ مقامی لوگوں نے ہندوؤں کے متروکہ مکانوں پر قبضہ جما لیا ہے۔ یہ اُن کا حق تھا جو انہیں نہ ملا۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ پاکستان اُن کا گھر ہے لیکن حقائق کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہم نے چونکہ حقائق کو نظرانداز کر دیا اس لئے معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی جن میں تلخیاں، انتقام، غصّہ اور احتجاج بھرا ہُوا ہے۔ ان والدین کی اولاد نے والدین کے غصّے اور احتجاج میں پرورش پائی۔ اُن کی طرف کسی نے توجّہ نہ دی۔ اس کا نتیجہ نفسیات کے ڈاکٹر اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر بھٹی صاحب نے کہا کہ یہ موضوع بہت لمبا ہے۔ ان کے پاس کچھ کیس آتے جو جسمانی امراض کے تھے، مگر اُن کا باعث نفسیاتی تھا۔ وہ سب لُٹے پٹے مہاجر تھے۔ نواز کے مرض کا تعلق بھی ہجرت کے ساتھ تھا لیکن مرض کے باعث کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ اس طرح کہ نواز مشرقی پنجاب کے ایک بڑے گاؤں کا رہنے والا تھا اور جالندھر میں کسی سرکاری محکمے میں کلرک تھا۔ اُس کی ماں تھی، بیوی تھی جو خوبصورت بھی تھی اور جوان بھی۔ چار سال کی عمر کی ایک بیٹی تھی اور ایک بہن تھی جس کی شادی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے تین مہینے پہلے ہوئی تھی۔ نواز کا باپ مر چکا تھا۔

ہندوؤں اور سکھوں نے جب مُسلمانوں کا قتلِ عام اور لُوٹ مار شروع کی اُس وقت نواز گھر تھا اور گھر ہی رہا۔ ان کے گاؤں کے تمام لوگ بروقت نکل آئے۔ کسی نے انہیں بتایا کہ ریل گاڑی کی اُمید پر جالندھر کا رُخ نہ کرنا ورنہ سارے مارے جاؤ گے۔ سارا گاؤں پیدل چل پڑا۔ سفر لمبا تھا۔ قافلہ آگے پیچھے بکھرتا گیا۔ آدھے سے زیادہ سفر طے ہو چکا تھا کہ قافلے پر سکھوں نے حملہ کر دیا۔ قافلے کے مرد کلہاڑیوں، برچھیوں، لاٹھیوں اور چھویوں سے مسلّح ہو کے آتے تھے۔ نواز نے سکھوں کے حملوں کی بڑی خوفناک باتیں سُنی تھیں۔ اُس کے پاس لاٹھی تھی۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ اُس کے گاؤں کے آدمیوں نے عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کر لیا تھا اور سکھوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے تھے۔ نواز گھبرا گیا۔ قریب ہی سرکنڈے تھے۔ وہ دوڑ کر ان میں جا چھپا۔

وہ سکھوں کی گرج اور مسلمانوں کی للکار اور نعروں سے خوف زدہ ہُوا
جا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کوئی ایک بھی مسلمان زندہ نہیں رہے گا۔
وہ سرکنڈوں میں سرکتا دوسری طرف جا نکلا اور بھاگ اُٹھا اور لاہور پہنچ
گیا۔ اس کی ذہنی حالت بہت بُری تھی۔ لاہور پہنچنے تک تو اُس پر موت کا
خوف سوار تھا۔ جب ریفیوجی کیمپ میں گیا اور اُسے اطمینان ہُوا کہ وہ اب
محفوظ ہے اور یہاں تک کوئی سکھ نہیں پہنچ سکتا تو اُسے یاد آگیا کہ وہ اپنی
ماں، جوان بہن، جوان بیوی اور چار سال کی معصوم بچّی کو سکھوں کے رحم وکرم
پر چھوڑ کر بھاگ آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھیانک خیال بھی آگیا کہ
سکھ اُس کی بہن اور بیوی کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے اور اُس کی ماں
اور بچّی کو قتل کر دیا ہوگا۔

اُس کے جسم میں آگ جل اُٹھی اور وہ اس قدر بے چین ہو گیا کہ
پاگلوں کی طرح سارے ریفیوجی کیمپ میں مہاجرین کو دیکھتا پھرا۔ اُسے اپنے
گاؤں کا کوئی ایک آدمی بھی نظر نہ آیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ سب شہید ہو گئے ہیں
اور اُس کی بہن اور بیوی کو سکھ لے گئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بُزدلی کے
طعنے دینے لگا۔ اُسے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا۔ وہ بُزدلی پر شرمسار بھی
ہونے لگا۔ اس سے اُس کی بھوک بھی ماری گئی اور نیند بھی اُڑ گئی۔

وہ صوبہ پنجاب کے کسی سرکاری محکمے میں لوئر ڈویژن کلرک تھا۔
چار یا پانچ دنوں بعد اُسے اپنے محکمے کا ایک آدمی مل گیا۔ اُس نے اسے
بتایا کہ وہ فوراً فلاں جگہ اپنی نوکری پر پہنچے۔ وہ آدمی دوسرے دن اُسے
اپنے ساتھ دفتر لے گیا اور اس کی نوکری از سرِ نو شروع ہو گئی۔ اُس کے
افسروں کی کوشش سے اسے چھوٹا سا ایک متروکہ مکان بھی مل گیا مگر نوکری
اور مکان مل جانے سے اُسے تھوڑا سا ذہنی سکون بھی نہ ملا۔ وہ دفتر میں تو
خاموشی سے کام میں لگا رہتا لیکن گھر میں اُس کی حالت بہت خراب ہو جاتی۔
کبھی تو وہ ایسے محسوس کرتا جیسے اُس کی ماں، بہن، بیوی اور بچّی دوسرے
کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں اور کبھی اُسے اُن کے طعنے سنائی دیتے

کہ وہ بُزدل ہے جو انہیں سکھوں کے حوالے کر کے بھاگ آیا ہے۔
اُس نے ڈاکٹر بھٹی صاحب کو اپنی بپتا سنا کر کہا ”کوئی مجھے یہ یقین
دلا دے کہ میرے گھر کی تمام عورتیں قتل ہو گئی تھیں تو مجھے سکون مل سکتا ہے۔
آج ایک سال ہو گیا ہے، میں نے سو کے نہیں دیکھا۔ نیند کی کوئی نئی اور تیز
گولی کھاتا ہوں تو ایک رات چند گھنٹے نیند آجاتی ہے۔ اگلی رات وہی گولی
مجھے ایک منٹ کی بھی نیند نہیں دے سکتی۔“

ڈاکٹر صاحب نے اُس کے ذہن سے اُس کا وہم نکالنے کی بہت کوشش
کی۔ اُسے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ بُزدل نہیں۔ ایسے حالات میں بھاگ آنا
بُزدلی نہیں تھی مگر نواز پر باتوں کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو
اپنا بازو ننگا کر کے دکھایا۔ اُس نے تین تعویذ باندھ رکھے تھے۔ وہ پیروں
اور عاملوں کے پاس جاتا رہا تھا۔ انہوں نے اسے تعویذ دیئے تھے۔ ڈاکٹر
صاحب نے اُسے کہا کہ اس کا علاج نہ تعویذوں میں ہے نہ نیند کی گولیوں
میں۔ اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ گولیاں اُسے جسمانی لحاظ سے بیکار
کر دیں گی۔

وہ دو تین بار پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے
نیند کی گولیوں کی بجائے باتوں سے اس کا نفسیاتی علاج کرنے کی کوشش
کی جو بالکل ناکام رہی۔ اس کے بعد نواز ڈاکٹر بھٹی صاحب کے پاس
نہ گیا۔

چھ ماہ بعد وہ پھر ڈاکٹر صاحب کے ہاں گیا۔ اب اُس کی حالت پہلے
سے زیادہ بگڑی ہوئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ اپنے مکان میں اکیلا رہتا ہے۔
محلّے میں دو کنبے مہاجروں کے آباد ہو گئے ہیں اور باقی گھر مقامی لوگوں کے
ہیں۔ ان سب کو جب پتہ چلا کہ نواز کا سارا خاندان ہجرت میں شہید ہو گیا ہے
تو سب نے اس کے ساتھ ہمدردی اور بھائی بندی شروع کر دی۔ ایک
مقامی گھرانے نے اس پر یہ مہربانی کی کہ اُسے اپنی لڑکی کا رشتہ دے کر سادگی
سے شادی کرا دی۔ نواز اس شادی پر اس وجہ سے خوش ہُوا کہ اُس کے ذہن

سے سارے بوجھ اُتر جائیں گے اور خونی یادوں سے چھٹکارا مل جائے گا مگر ہُوا اس طرح کہ جب نئی بیوی اُس کے پاس ہوتی تو اُسے پہلی بیوی اتنی شدّت سے یاد آتی کہ وہ صاف محسوس کرتا کہ اس کی پہلی بیوی کمرے میں موجود ہے۔ کبھی اُسے پہلی بیوی کے طعنے سنائی دیتے کہ تم بُزدل ہو۔ تم مرد نہیں ہو۔ اس ذہنی حالت میں اُس کا پسینہ پھوٹ آتا۔

دوسری بیوی نے اُس کی یہ حالت دیکھی تو پہلے برداشت کرتی رہی پھر اُس نے اپنے ماں باپ کو بتایا۔ ہمارے معاشرے کی یہ بہت بڑی خرابی ہے کہ لوگوں کی اکثریت اَن پڑھ اور پسماندہ ہے۔ کسی کی نفسیاتی خامی اور اس کے پس منظر کو کوئی نہیں سمجھتا اور کوئی معاف بھی نہیں کرتا۔ لڑکی کے باپ نے نواز سے پوچھا کہ اُسے کیا تکلیف ہے۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے ذہن سے وہ خون اُترا نہیں جو اُس نے ہجرت میں بہتے دیکھا ہے۔ اُس نے انسانوں کو زندہ جلتے دیکھا ہے اور میلوں تک لاشیں پڑی دیکھی ہیں جنہیں گِدھ کھا رہے تھے۔

نواز کے سُسرال نے تین مہینے صبر کئے رکھا۔ نواز کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ ایک روز نئی بیوی نے اُسے طعنہ دے دیا کہ تم اندر سے خالی ہو اور تم کسی عورت کے قابل نہیں ہو۔ ڈاکٹر بھٹی صاحب نے اُسے بتایا کہ اُس پر وہم کے اثر کے علاوہ نیند کی گولیوں کا اثر زیادہ ہے۔ یہ گولیاں جسمانی طاقت کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہیں مگر نواز اب کچھ بھی سمجھنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ اس کی بیوی نے اپنے گھر زیادہ دن رہنا شروع کر دیا اور نواز کے ساتھ بول چال بند کر دی، پھر اس کے باپ نے ایک روز اُسے کہا کہ وہ اُس کی بیٹی کو طلاق دے دے۔

نواز نے خاموشی سے طلاق دے دی۔

اب وہ پاگل پن کی حالت میں جا پہنچا تھا۔ اُس پر ڈاکٹر صاحب کی باتوں کا پہلے ہی کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا، اب تو اُس کی ذہنی حالت اس قابل ہی نہیں تھی کہ وہ کچھ سمجھتا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کیس مجھے سناتے ہوتے

کہا کہ یہ تو اپنی قسم کا ایک کیس تھا، خُدا جانے کتنے ہزار کیس جو ابنارمل حالت تک پہنچے، بگڑ رہے تھے۔

"مجھے جنگِ عظیم کے نفسیاتی اور معاشرتی اثرات یاد آتے" —— ڈاکٹر بھٹی صاحب نے کہا —"ترقی یافتہ قوموں نے باقاعدہ جائزہ لیا تھا۔ اُن کے ماہرینِ نفسیات نے کئی کیس ٹھیک کر لئے ہوں گے پھر بھی جنگ کے اثرات معاشرے کا ناسور بن گئے۔ پاکستان میں ابتدا میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ نفسیاتی علاج کا کوئی کلینک ہوتا، اب بھی ایسا کوئی کلینک نہیں۔ وہ جو اپنے آپ کو سائیکاٹرسٹ کہتے ہیں وہ بھی ذہن کو عارضی سکون اور نیند کی دوائیاں دیتے ہیں جن سے مریض نشے کی حالت میں زندہ رہتا ہے، دماغی اور جسمانی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کی ہجرت، قتلِ عام، وسیع پیمانے پر آبرو ریزی اور آتش زنی جس میں بچوں کو زندہ جلایا گیا اور یہاں کی کسمپرسی اور جھگیوں اور احاطوں اور خانہ بدوشی کی زندگی کے اثرات جنگِ عظیم سے زیادہ گھناؤنے تھے۔ ان لوگوں کی آبادکاری میں ذہنی آبادکاری کو زیادہ اہمیت ملنی چاہئے تھی مگر ہمارے معاشرے کا تو یہ عالم ہے کہ گھروں میں آباد ماں باپ، خصوصاً باپ اپنی فطرت اور ذہنیت کی تنگی اور تنگ نظری سے اپنی اولاد کو ذہنی مریض بنا دیتے ہیں، پھر یہ اولاد جوانی سے پہلے ہی ایک قدرتی اور لاشعوری عمل کے تحت جنسی بے راہ روی اور آوارگی کا شکار ہو جاتی ہے۔"

نواز کو چونکہ ڈاکٹر بھٹی صاحب سے ہمدردی اور خلوص ملتا تھا اس لئے وہ ان کے پاس چلا جاتا تھا اور اُس نے کئی بار کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس بیٹھ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مریضوں کو سکون دینے کے لئے اپنا کلینک اُجاڑ دیا ہے۔ انہوں نے نواز کو دو دوائیاں دیں۔ میں نے اُن سے دوائیوں کے نام پوچھے تو ڈاکٹر صاحب نے اس وجہ سے نام نہ بتائے کہ بعض لوگ کسی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر دوائیاں کھانی شروع کر دیتے ہیں۔ پرچے میں دوائی کا نام نہیں لکھنا چاہئے۔

دو مہینوں بعد وہ پھر ڈاکٹر صاحب کے ہاں گیا اور ایک سپیشلسٹ کا نسخہ دکھایا۔ اُس نے اپنی حالت یہ بتائی کہ دفتری کام میں بھی اُس سے غلطیاں اور کوتاہیاں ہو رہی تھیں اور وہ نسیان کا مریض ہو گیا تھا۔ وہ ایک منٹ پہلے کی بات بھول جاتا تھا وہ اب EMOTIONAL CRISIS کا شکار ہو کر INSANITY میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس پر اس جُرم کا آسیب پہلے سے زیادہ شدت سے سوار ہو گیا تھا کہ وہ بُزدل ہے اور اس کی بُزدلی کی وجہ سے اُس کی ماں اور بچی قتل ہو گئی ہیں اور اس کی بہن اور بیوی کو سکھ لے گئے ہیں۔ اب اُس میں یہ وہم بھی پیدا ہو گیا تھا کہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے وہ دوسری شادی کے قابل نہیں رہا۔

آج کل تو سرکاری دفتروں میں کام کرنے سے اہل کار جی چراتے ہیں، ابتدا میں سرکاری افسر اور کلرک پورے خلوص اور دیانتداری سے کام کرتے تھے۔ غلطی اور کوتاہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نواز سے اُس کی غلطیوں کی باز پرس ہونے لگی۔ اُس کے افسر نے اُسے کہا کہ وہ مہاجر ہے اس لئے اُسے زیادہ اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ پاکستان کی قیمت کیا دی گئی ہے اور وہ کام نہیں کرتا۔ نواز اپنے افسر کے سامنے رو دیا، اور اُسے اپنی ذہنی حالت بتا دی۔ افسر کوئی اچھا آدمی تھا۔ اُس نے نواز کو ذہنی امراض کے ایک سپیشلسٹ ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ اس ڈاکٹر نے اُسے انتہائی تیز دوائیاں لکھ دیں جو ڈاکٹر بھٹی صاحب اُسے نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان دوائیوں کا یہی اثر تھا کہ وہ باقی عمر سویا رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اُسے ایک بار پھر سمجھایا کہ وہ اپنے آپ پر خود قابو پانے اور نارمل انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے مگر وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس کے حواس کو ان نئی دوائیوں نے مفلوج کر دیا تھا۔

پھر ڈیڑھ سال گزر گیا۔ نواز ڈاکٹر صاحب کے پاس نہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب اُسے ذہن سے اُتار چکے تھے۔ ڈیڑھ سال بعد نواز اچانک ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں آگیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو اُس نے ڈاکٹر بھٹی صاحب کے

آگے رکھ کر کہا کہ یہ سوجی اور نشاستے کے لڈو ہیں جو اُس کی بیوی نے اپنی بھینس کے گھی سے بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو نواز یاد آگیا لیکن یہ آدمی نواز نہیں ہو سکتا تھا۔ شکل وصورت اور قد بُت نواز جیسا ہی تھا۔ وہ نواز ہی تھا مگر ہشاش بشاش اور چُست و مستعد۔ اُس کے چہرے پر رونق تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو جب یقین آگیا کہ یہ نواز ہی ہے تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح ٹھیک ہُوا ہے۔

نواز نے ایک ایسی کہانی سنائی جس میں ہم سب کے لئے سوچنے کا بہت سارا مواد ہے۔ وہ ایک دفتری کام کے سلسلے میں راولپنڈی گیا۔ ریل گاڑی پر واپس آرہا تھا تو لالہ موسیٰ سٹیشن پر گاڑی زیادہ دیر رُکی۔ ابھی کوئلے والے انجن چلتے تھے۔ وہاں انجن تبدیل ہُوا کرتا تھا۔ نواز پلیٹ فارم پر اُترا اور ٹہلتے ٹہلتے جب ایک زنانہ ڈبے کے سامنے سے گزرا تو اُس کی نظریں ایک عورت کے چہرے پر رُک گئیں جو زنانہ ڈبے کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھی نواز کو ہی دیکھ رہی تھی۔ نواز کے پاؤں بھی جکڑے گئے۔

اس کے سامنے کھڑکی میں اُس کی پہلی بیوی بیٹھی ہوتی تھی جسے وہ سمجھا تھا کہ سکھ لے گئے ہوں گے۔

نواز کی ذہنی حالت پہلے ہی بگڑی ہوتی تھی۔ دماغ کو دوسرے ڈاکٹر کی دی ہوتی تیز گولیوں نے سلایا ہُوا تھا۔ اُس نے سمجھا کہ اپنی پہلی بیوی کو خواب میں دیکھ رہا ہے۔ اُسے ایک آواز سنائی دی "ابو جی!" — یہ اُس کی بچی کی آواز تھی جو اب چھ سات سال کی ہو چکی تھی۔ نواز اسے خواب ہی سمجھتا رہا اور اُس کی نظریں اپنی بیوی اور بچی پر جمی رہیں۔ اتنے میں ایک اور چہرہ اُس کے سامنے آگیا۔ یہ اُس کا سُسر تھا جو اپنی بیٹی یعنی نواز کی بیوی کو دیکھنے آیا تھا۔ نواز کی بیوی نے اپنے باپ کو اشارے سے بتایا کہ وہ نواز کھڑا ہے۔ سُسر نے اُسے دیکھا اور حیرت سے آہستہ آہستہ نواز کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے نواز سے پوچھا — "تم نواز ہو؟"

نواز اچانک بول پڑا — "نہیں۔ میں نواز نہیں ہوں" — اور وہ

وہاں سے ہٹنے لگا۔

اُس کی بیوی گاڑی سے اُتر آئی۔ بچی اُس کے ساتھ تھی۔ بچی نواز کی طرف لپکی۔ وہ ان اڑھائی برسوں میں اپنے ابّو کو بھولی نہیں تھی۔ نواز کو چکر آنے لگے۔ سُسر نے اُسے گلے لگا لیا اور پھر اس کے دو بڑے قریبی رشتہ دار بھی آگئے اور پھر اُس کی بہن بھی اُس کے سامنے آگئی۔ اُس کے ساتھ اُس کا خاوند بھی تھا اور چند مہینوں کا ایک بچہ بھی۔ تب نواز کو حقیقت کا احساس ہُوا۔ اُس نے ایک بار پھر کہا کہ میں نواز نہیں ہوں لیکن اُس کے کانوں میں کسی کی آواز پڑی ـــ "اس پر تو کوئی اثر معلوم ہوتا ہے۔"

اس آواز کے بعد نواز کو یاد نہیں کہ کیا ہُوا۔ وہ نہ بتا سکا کہ اُس پر غشی طاری ہوگئی تھی یا واقعی اُس پر کوئی آسیبی اثر ہو گیا تھا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ اُسے خواب کی طرح کچھ باتیں یاد ہیں۔ وہ جس ڈبے میں بیٹھا تھا وہ ان رشتہ داروں کے ساتھ وہاں تک بھی گیا تھا اور اُس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا تھا اور جس ڈبے میں وہ لوگ بیٹھے تھے وہاں جا کر بیٹھا تھا۔

مختصراً یہ ڈرامہ یُوں ہُوا کہ یہ لوگ گجرات کے ایک گاؤں میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ سب سکھوں کے حملے سے بچ کر نکل آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس گاؤں کے تمام آدمی کلہاڑیوں، برچھیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر پاکستان کو روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے موت کو قبول کر لیا تھا اس لئے یہ ارادہ لے کر چلے تھے کہ مرنا ہی ہے تو لڑ کر مریں گے اور جب دیکھا کہ سکھ جیت رہے ہیں تو اپنے ساتھ جتنی لڑکیاں ہوں گی انہیں اپنے ہاتھوں قتل کر دیں گے۔ اس ارادے اور غیرت مندی نے انہیں بہت قوت اور حوصلہ دیا۔ سکھوں نے حملہ کیا۔ نواز کے گاؤں والوں نے مستورات کو درمیان میں کر کے ان کے ارد گرد حصار بنا لیا اور ایسا مقابلہ کیا کہ کئی سکھ مارے گئے۔ کچھ مسلمان بھی شہید اور زخمی ہُوئے۔

سکھ مرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ وہ بھاگ نکلے اور کم از کم یہ قافلہ پاکستان تک اس حد تک خیریت سے پہنچ گیا کہ صرف تین چار آدمی شہید اور پندرہ بیس زخمی ہوئے۔ نواز کو اپنے ساتھ نہ پا کر انہوں نے

یقین سے کہہ دیا کہ وہ بھی شہید ہو گیا ہے۔ وہ لاشیں اپنے ساتھ لانے کے لئے نہیں رُک سکے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ سکھ بھاگ گئے ہیں، وہ اب زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ انہیں زیادہ خیال مستورات کا تھا۔ چنانچہ قافلہ بھاگتا دوڑتا پاکستان میں داخل ہوگیا۔

پاکستان میں نواز کے تمام رشتہ داروں کو کوئی ہمدرد راہنما مل گیا اور انہیں گجرات لے گیا۔ وہاں انہیں ایک گاؤں میں لے گئے جہاں ہندو اور سکھوں کی آبادی زیادہ تھی۔ وہ سب ہندوستان چلے گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو قرضے دے کر زمینیں گروی رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ زمینیں انہی کے نام پر تھیں۔ وہ نواز کے رشتہ داروں کو مل گئیں اور وہ آباد ہو گئے۔ یہ اُن خوش نصیب مہاجرین میں سے تھے جنہیں کوئی ہمدرد مل گیا تھا جس نے انہیں ذاتی دلچسپی اور کاوش سے آباد کر دیا۔

نواز کے متعلق سب کو یقین تھا کہ شہید ہو گیا تھا۔ نواز کی بیوی جوان تھی۔ اُسے کہا گیا کہ وہ شادی کر لے لیکن وہ نہ مانی۔ دیہاتیوں میں لڑکی کی رائے اور فیصلے کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ اُس کی مرضی کے خلاف رشتہ طے کر دیا گیا مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اُس نے اپنے خاوند کو مرتا دیکھا نہیں، نہ اُس کی لاش دیکھی ہے۔ اس جواں سال عورت نے ایسا رویّہ اختیار کیا کہ سب خاموش ہو گئے۔ اس کے باپ نے اسے مار پیٹ کر منوانے کی ترکیب کی مگر ناکام رہا۔

نواز کو یہ باتیں بعد میں پتہ چلیں۔ گاڑی لالہ موسیٰ سے چل پڑی۔ نواز حواس باختہ تھا۔ اُسے رشتہ داروں نے گجرات اتار لیا۔ وہ ایک شادی پر گئے تھے اور اس گاڑی سے واپس آرہے تھے۔ نواز گاڑی سے اپنے سوٹ کیس سمیت اُتر آیا لیکن اُس نے پھر کہہ دیا کہ وہ نواز نہیں اور وہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ وہاں تماشائی اکٹھے ہو گئے۔ ان میں دو بزرگ اور پولیس کا ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھے جو آگے ہوئے اور نواز سے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اُس نے اُکھڑے ہوئے اور نیم خوابیدہ لہجے میں بات کی تو ہیڈ کانسٹیبل نے اُسے دھمکایا

کہ وہ دھوکہ دہی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ دونوں بزرگوں نے بھی اُسے بہت
کچھ کہا اور وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اُن کے گاؤں چلا گیا۔ اُسے یہ بھی
یاد نہ رہا کہ اُسے لاہور اپنے دفتر میں پہنچنا ہے۔

گاؤں میں اُس کی بیوی نے الگ بٹھا کر اور رو رو کر اُسے بتایا کہ اُس
کی خاطر اُس نے دوسری شادی نہیں کی مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ وہ کسی کی
بات نہیں مان رہا تھا۔ اس کی ماں کو تیز بخار تھا اور وہ سوتی ہوتی تھی اس
لئے اُسے نہ جگایا گیا۔ اُس کی جب آنکھ کھلی تو اُسے کسی نے بتایا کہ تمہارا بیٹا
نواز زندہ ہے اور آ گیا ہے۔ ماں کو بخار نے نڈھال کر رکھا تھا مگر بیٹے
کا سُن کر وہ اُٹھی اور ڈیوڑھی کی طرف دوڑ پڑی جہاں اُس کا بیٹا بہت سے
آدمیوں میں بیٹھا تھا اور کسی کو پہچان نہیں رہا تھا۔

ماں ڈیوڑھی میں چلی گئی اور نواز کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئی کہ اُس
کا مریض جسم اتنی خوشی برداشت نہ کر سکا۔ نواز نے اُسے دیکھا تو اس نے
اپنے آپ میں دھچکہ سا محسوس کیا۔ ماں چکرائی اور گر پڑی۔ نواز کے مُنہ
سے بے ساختہ بلند آواز نکلی ——"ماں جی"—— اور اُس نے دوڑ کر ماں کو اُٹھایا۔
نواز نے ڈاکٹر صاحب کو سنایا کہ ماں کا اثر تھا کہ اُس کے دماغ کی سوئی ہوئی
رگیں بیدار ہو گئیں اور وہ سب کو پہچاننے لگا۔ ماں جلدی ہوش میں آ گئی اور
نواز کی بلائیں لینے لگی۔ ماں کے بوسوں اور بے تابانہ محبت نے نواز کو حقیقت
میں گھسیٹ لیا۔

حقیقت میں نواز پر پھر وہی احساسِ جُرم سوار ہو گیا تھا کہ وہ اپنے گھر کی
مستورات کو سکھوں کے حوالے کر کے بھاگ آیا تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگ ملنے
آتے تو وہ نظریں جُھکا لیتا۔ وہ ہر کسی سے شرمسار تھا۔ اُسے جب سنایا گیا کہ
گاؤں کے ان آدمیوں نے کس طرح سکھوں کا مقابلہ کیا تھا تو اُس کی ذہنی
حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔

اُس نے اپنے سُسر سے کہا کہ اُسے لاہور اپنی ڈیوٹی پر جانا ہے۔
سُسر نے دیکھ لیا تھا کہ نواز کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔ اسے وہ "کوئی اثر"

یعنی آسیبی اثر سمجھ رہا تھا۔ اُس نے رشتہ داروں میں سے دو پڑھے لکھے آدمی
نواز کے ساتھ کر دیئے۔ نواز لاہور پہنچا۔ اگلے روز دفتر گیا تو اُس نے
اپنے افسر کو جس کے دل میں اُس کی ہمدردی تھی، بتایا کہ اُسے اپنے عزیز
مل گئے ہیں لیکن اُس کی ذہنی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ اس
افسر نے اُسے ڈیڑھ مہینے کی چھٹی دے دی۔

وہ اپنے گاؤں چلا گیا مگر وہ نارمل زندگی میں رواں نہیں ہو رہا تھا۔
اُسے خانقاہوں پر لے جایا گیا۔ عاملوں اور دو پیروں کو دکھایا گیا۔ سب
نے اس پر جنات کا اثر بتایا۔ ایک روز اُس کی ملاقات ایک ایسے آدمی
سے ہو گئی جو مذہب سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اُس نے نواز کو الگ بٹھا کر
پوچھا کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے اور اس کی یہ حالت کس طرح ہوئی ہے۔ نواز نے
اُسے ساری بات سنا دی۔ اس شخص نے بڑی دلچسپی اور ہمدردی سے اس
کی ساری کہانی سُنی اور اُسے کہا کہ وہ خُدا کو بھلا بیٹھا ہے۔ خُدا نے انسان کو
ایسی طاقت دی ہے جو جنوں اور بھوتوں کو بھگا سکتی ہے۔

اس شخص نے اُسے خُدا اور عبادت پر بڑا لمبا لیکچر دیا اور اُسے قرآن
کی ایک آیت یاد کرا کے کہا کہ ہر نماز کے بعد اس کا ورد چالیس مرتبہ ایسی
یکسوئی سے کرے کہ اُسے دُنیا کی ہوش نہ رہے۔ اُس نے نواز کو اس آیت
کے معنی اور مفہوم بھی سمجھایا اور کہا کہ خُدا اس کی زندگی میں انقلاب لاتے گا۔
اس شخص کی باتوں میں ایسا اثر تھا کہ ہر بات دل میں اُتر گئی اور اُس نے
خُدا سے تعلق قائم کر لیا مگر اپنی بیوی، بچی اور بہن اور ماں کے سامنے جاتا تو
اُس کی ذہنی حالت بگڑ جاتی۔

ایک روز اُس کی بیوی رو پڑی اور بولی ——"جس عورت کا خاوند
تم جیسا ہو اُسے پرائے مرد کھیتوں میں کیوں نہیں روکیں گے۔ سکھوں سے
تو میں بچ کے آ گئی تھی لیکن یہاں اپنوں سے عزت بچانا مشکل نظر آ رہا ہے۔"
نواز تڑپ اُٹھا اور اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے بیوی
سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ بیوی نے اسے بتایا کہ اس گاؤں کا ایک

مقامی آدمی جو ذرا اُونچی قسم کا زمیندار ہے، اُسے بڑے بیہودہ پیغام بھیجتا ہے۔ اُس نے نواز کی بیوی کو تین چار مرتبہ کھیتوں میں روکا اور اُسے دس دس روپے کے نوٹ دکھائے تھے۔ اس عورت نے اپنے خاوند کو بھی نہیں بتایا تھا۔ نواز کی ذہنی حالت دیکھ کر اُسے تو وہ بتانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

نواز نے اپنی بیوی سے اور کچھ نہ پوچھا۔ صرف یہ پوچھا کہ اس آدمی کا نام کیا ہے۔ بیوی ڈر گئی۔ اس نے نواز سے کہا کہ وہ تین چار بھائی ہیں نمبردار کے ساتھ بھی اُن کا دوستانہ ہے اور ان کے پاس روپیہ پیسہ بھی ہے۔

بیوی نے کہا کہ ہمیں یہ لوگ مہاجر، غریب اور پردیسی سمجھتے ہیں۔ نواز نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ رات کو اُسے نیند تو آتی نہیں تھی، وہ جاگتا رہا۔ صبح ہوتی تو وہ لاٹھی لے کر باہر نکل گیا۔ گاؤں کے درمیان ایک کھُلی جگہ تھی۔ وہاں جا کھڑا ہوا اور ایک لڑکے کو اُس شخص کا نام بتا کر کہا کہ اُسے بلا لاؤ۔ لڑکا اُسے بُلا لایا۔

نواز نے اُسے کہا کہ تم خالی ہاتھ آتے ہو۔ جاؤ اپنے بھائیوں کو ساتھ لے آؤ اور لاٹھی کلہاڑی بھی لے آؤ۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ جب تک زندہ رہو گے، یاد رکھو گے کہ کسی کی بیوی پر بُری نظر ڈالی تھی۔ نواز کے اندر طاقت بیدار ہو گئی تھی۔ اس شخص نے نواز کو غریب اور کمزور مہاجر سمجھ کر اس کا مذاق اُڑایا۔ نواز نے لاٹھی پھینک کر اُسے گھونسوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ گاؤں میں شور مچ گیا۔ اس شخص کے بھائی دوڑے آئے۔ نواز نے لاٹھی اُٹھالی اور للکار کر ان سب کے سامنے آگیا۔ دو کو اُس نے اوندھا کر دیا۔ نواز کے رشتہ دار بھی آگئے۔ نواز نے سب کو پیچھے ہٹا دیا اور بولا کہ جب تک زندہ ہوں اکیلا مقابلہ کروں گا۔

اور اُس نے اکیلے مقابلہ کیا۔ مقامی لوگ جمع ہو گئے۔ بیچ بچاؤ سے لڑائی بند ہو گئی۔ نواز نے مقامی آدمیوں سے کہا کہ وہ کافر تھے جنہوں نے ہماری عورتوں کو اغوا کیا تھا۔ تم ان کافروں سے زیادہ ذلیل ہو جو اپنے مذہب کی عورتوں پر بُری نظر ڈالتے ہو۔ اس کی آواز میں گرج تھی۔ اس نے چار آدمیوں

کو اُلٹا کر دیا تھا۔ بات پولیس تک نہ پہنچی۔ بڑوں نے راضی نامہ کرا دیا۔

اُس رات نواز کی زندگی میں یہ انقلاب آیا کہ اُسے اتنی گہری نیند آئی کہ اُسے کوئی گولی کھانے کا بھی خیال نہ رہا۔ آنکھ اُس وقت کھُلی جب سورج اُوپر آگیا تھا۔ پھر اُس نے اُس وقت بہت ہی سکون محسوس کیا جب وہ باہر نکلا تو گاؤں میں سے گزرتے اُس کا سر اپنے آپ اُونچا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ سر جھکا کر اور مریضوں کی طرح چلا کرتا تھا۔

اُس نے ڈاکٹر بھٹی کو یہ واقعہ سنا کر کہا — "ڈاکٹر صاحب! مجھ پر ایک قرض تھا۔ وہ میں نے ادا کیا کر دیا تو میرا روگ ختم ہو گیا۔ ایک قرض خُدا کا میرے سر تھا۔ کئی برسوں کے سجدے میرے ذمّے تھے جنہیں میں بھول گیا تھا۔ وہ پورے کئے، پھر اپنی بیوی اور بہن کا قرض تھا کہ میں نے اُن کی آبرو کی پرواہ نہ کی اور بھاگ آیا تھا۔ میں نے یہ قرض بھی ادا کر دیا ہے۔ اب گولیوں کے بغیر نیند آجاتی ہے۔ جسم میں جان آگئی ہے۔"

فہرست

راشدہ تبسّم ایم۔ اے (نفسیات)

میں اُسے ڈھونڈ رہی ہوں

اُس تک پہنچنا میرے لئے کبھی ممکن نہ ہوتا اور میں آپ کو یہ نفسیاتی کیس کبھی نہ سنا سکتی۔ یہ کیس جسے میں نفسیاتی کہہ رہی ہوں دراصل پاکستان کے اُس معاشرے کا کیس ہے جو اپنے آپ کو پاکستانی نہیں سمجھتا اور پاکستانی کہلانے کو اپنی توہین کہتا ہے۔ میں جس معاشرے سے تعلق رکھتی ہوں، اس کے کسی فرد کا گزر اُس معاشرے سے نہیں ہو سکتا۔ میرا اُدھر جانے کا سبب یُوں بنا کہ یہ کیس کچھ عرصہ اُس ڈاکٹر کے پاس بھی رہا تھا جن کے ساتھ میں نے کچھ عرصہ کام کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نفسیاتی امراض کے بھی معالج ہیں اور میری بھی یہی لائن ہے۔ نفسیاتی کیسوں میں میری غیر معمولی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یہ کیس مجھے صرف سنایا نہیں مجھے مریضہ تک بھی پہنچا دیا۔

میں کسی کا نام ظاہر نہیں کروں گی۔ ڈاکٹر صاحب کا نام بھی نہیں لکھ رہی۔ کوئی نام لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ نام اصلی نہیں ہو گا۔ آپ یہ کیس پڑھیں گے تو خود ہی محسوس کریں گے کہ نام راز میں ہی رہنے چاہئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مریضہ کے ساتھ میری ملاقات کا انتظام ایسا کرا دیا تھا کہ میں مریضہ کی کوٹھی میں گئی تو مجھے اُس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ میرے انتظار میں تھی لیکن وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی نہیں تھی۔ صوفے پر بیٹھی تھی کیونکہ اُسے کوئی جسمانی عارضہ نہیں تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی لیکن

یہ مسکراہٹ اُداس تھی۔

پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس کوٹھی میں داخل ہو کر مجھے یوں لگا جیسے میں امریکہ میں آگئی ہوں۔ کسی کمرے میں انگریزی موسیقی کا ٹیپ چل رہا تھا۔ یہ پاپ میوزک تھا جو میوزک کم اور ہلّہ گلّہ زیادہ ہوتا ہے۔ مجھے ایک وسیع وعریض ہال جیسے کمرے سے گزار کر مریضہ کے کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ اس ہال میں فرنیچر اور ڈیکوریشن کی ایسی اشیاء سجی ہوئی تھیں جن کے میں نام بھی نہیں جانتی۔ مٹی کے دو بُت رکھے تھے جو تقریباً چار چار فٹ اُونچے تھے۔ یہ عورتوں کے بالکل عریاں بُت تھے۔ دیواروں کے ساتھ نیم عریاں مغربی عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

اس ہال میں ایک عورت ملی جس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن گہرے میک اپ، کٹے ہوئے بالوں کی مصنوعی سیاہی، آدھے ننگے سینے اور بناوٹی مسکراہٹ سے وہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ بوڑھی نہیں ہوئی اور وہ کسی کی ماں نہیں۔ اُس نے گردن کو عجیب سا خم دے کر یورپی سٹائل سے مجھے کہا ـــ "ہیلو! ..... او کے؟ ..... فیلنگ فائن؟ ..... گڈ!" ـــ مجھے یقین ہے کہ اس کی انگریزی یہیں پہ ختم تھی۔ وہ کولہے مٹکاتی اور مسکراتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

اس خوشنما اور سجے سجائے ہال میں لکڑی کی سیڑھیاں اُترتی تھیں۔ اُوپر سے ایک جوان سال آدمی اُترتا آ رہا تھا۔ وہ بلاشک وشبہ کوئی ہپی تھا۔ بالکل اُن غیر ملکی ہپیوں کی طرح جنہیں آپ سڑکوں پر آوارہ پھرتے دیکھا کرتے ہیں۔

اس ہپی نے پہلے مجھے "ہائے" یا "ہائی" کہا۔ یہ ہائے یا ہائی کے درمیان کوئی لفظ تھا۔ پھر اُس نے اپنی "ممی" کو انگریزی میں کہا کہ وہ ذرا باہر جا رہا ہے۔ "ممی" نے "ٹاٹا" کہا اور ممی کا ہپی بیٹا مجھے گھورتا باہر نکل گیا۔

"آپ ادھر آجائیں" ـــ اُس نوکرانی نے مجھے کہا جو مجھے محل جیسی اس کوٹھی کے اُس کمرے میں لے جا رہی تھی جہاں مریضہ تھی۔

میں اُس کے پیچھے چل پڑی۔ ایک گلی سی میں سے گزار کر نوکرانی نے

ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر اطلاع دی ـــ "مس راشدہ تبسم"۔

"اندر بھیج دو۔ تم جاؤ" ـــ اندر سے جوان سی آواز آئی ـــ "اور کافی لے آؤ۔"

نوکرانی مجھے اندر داخل کر کے چلی گئی۔ میں نے اس کوٹھی کو باہر سے بھی دیکھا، اندر سے بھی دیکھا۔ یہاں رہنے والی ایک عورت اور اُس کے بیٹے کو بھی دیکھا۔ یہ کوٹھی پاکستان کی معلوم نہیں ہوتی تھی، یا یُوں کہہ لیں کہ پاکستان اس کوٹھی کے گیٹ پر ختم ہو گیا تھا اور وہاں سے وہ مغرب شروع ہو گیا تھا جس نے ہمارے کلچر اور روایت کو نگل لیا ہے، لیکن میں جب مغرب کی اس کوٹھی کے اُس کمرے میں داخل ہوئی جس میں مریضہ تھی تو یوں لگا جیسے مجھے اس کوٹھی میں سے یا مغرب میں سے نکال کر پاکستان میں دھکیل دیا گیا ہو۔ کمرے میں معمولی قسم کا صوفہ سیٹ تھا جیسا متوسط طبقے کے لوگ اپنی بیٹیوں کو جہیز میں دیا کرتے ہیں۔ ویسا ہی ایک پلنگ بچھا تھا۔ ایک طرف میز اور کرسی تھی۔ مجھے جس چیز نے زیادہ حیران کیا وہ ایک فریم تھا جس میں لکھا تھا ـــ "اللہ۔ محمدؐ" ـــ اس کے سوا دیواروں پر کوئی تصویر نہیں تھی۔

وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک فُل سکیپ کاغذ تھا جو ایک موٹے گتے پر رکھا تھا اور پنسل بھی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور گتا اور پنسل ایک طرف رکھ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ میں بہت پریشان ہوں۔ تم کیوں آگئی ہو!

میں چونکہ اُس کے کیس کا مطالعہ کرنے گئی تھی اس لئے میں نے کاغذ کو دیکھا جو اُس نے الگ رکھ دیا تھا۔ اس پر اُس نے کسی مرد کا چہرہ پنسل سے بنایا تھا اور اُسے پنسل کے شیڈ دے رہی تھی۔ یہ آٹھ دس سال کی عمر کے بچے کا بنایا ہُوا سکیچ لگتا تھا۔ میری نظر اُس کی میز پر گئی۔ وہاں ایسے ہی تین کاغذ پڑے تھے۔ ہر کاغذ پر پنسل سے مرد کا چہرہ بنا ہُوا تھا۔ میں

نے ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ اٹھا لئے۔ کوئی ایک بھی سکیچ اس قابل نہیں تھا کہ اس کی تعریف کی جاتی۔ یہ سکیچ ویسے ہی تھے جیسے کوئی فارغ بیٹھا ہُوا ہو اور بوریت سے بچنے کے لئے پنسل لے کر کاغذ پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں ڈالنی شروع کر دے۔ اس کے باوجود میں نے اُس کی پنسل ڈرائنگ کی تعریف کی۔

"یہ میری ہابی ہے"۔ اُس نے کہا۔ "یہ تصویریں کسی تعریف کے قابل نہیں۔ آپ سائیکالوجی کی ایم۔ اے ہیں نا، میں جانتی ہوں آپ میرا دِل رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں"۔ وہ ٹھہری ٹھہری، اُداس اُداس آواز میں رُکے بغیر بولے جا رہی تھی۔ "میرے ڈیڈی ابھی تک امید لگاتے بیٹھے ہیں کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گی .... میں تو اپنے آپ کو نارمل سمجھتی ہوں۔ یہ لوگ مجھے نارمل نہیں سمجھتے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر اور دو ڈاکٹر اپنی قابلیت آزما چکے ہیں۔ اب انہوں نے آپ کو میرے پاس بھیج دیا ہے"۔ اُس نے ہلکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔ "آپ تو میری ہم عمر ہیں۔ آپ کو اتنا تجربہ کہاں ہو گا کہ میرا کیس سنبھال سکیں۔"

"میں آپ کا علاج کرنے نہیں آئی"۔ میں نے کہا۔ "آپ کے متعلق مجھے میرے ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ وہ آپ کو نارمل ذہنی حالت میں نہیں لا سکے بلکہ وہ آپ کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ مجھے آپ جیسے انسانوں کے ساتھ دلچسپی ہے، اور یہ میری لائن بھی ہے .... اگر آپ مجھے سہیلی سمجھیں تو میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی۔"

پھر میں نے اُس کے ساتھ بہت باتیں کی۔ وہ میرا مقصد اور نیت سمجھ گئی۔ آخر ہم عمری بھی تھی۔ وہ میرے ساتھ بے تکلف ہو گئی۔ ہم ایک دوسری کو آپ کی بجائے تم کہنے لگیں۔ اُس وقت اُس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ اب اٹھائیس انتیس ہو گی۔ قدبُت بڑا اچھا ہے۔ چہرہ بھی اچھا ہے لیکن وہ کسی ناول یا افسانے کی ہیروئن کی طرح حسین نہیں۔ رنگ گورا ہے جس پر اندرونی غبار اور خلفشار کی ہلکی ہلکی زردی بھی اچھی لگتی تھی اور اُس کے اُداس اُداس انداز میں بھی مجھے کشش سی دکھائی دی تھی۔ اُسے اپنے ساتھ بے تکلف کر کے میں نے

اُس کے سینے میں اُترنے کی کوشش شروع کر دی جو اس لئے جلدی کامیاب ہو گئی کہ اُس نے مجھے ہم عمر سہیلی تسلیم کر لیا تھا اور میں نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ میں اس کے علاج کے لئے نہیں آئی، نہ میں کسی کیس کا علاج کرنے کے قابل ہوں، نہ مجھے کسی ڈاکٹر نے اُس کے دل کا راز معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

"اس ملک میں نفسیاتی علاج ہے ہی نہیں"۔ اُس نے کہا۔ "ایک سال یہ ڈاکٹر مجھے گولیاں دیتے رہے جن سے میں دن رات سوئی رہتی یا غنودگی میں پڑی رہتی تھی۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی پاگل کو نیند اور سکون کی گولیاں کچھ عرصہ دیتے رہو تو وہ نارمل ہو جاتا ہے .... یہ لوگ خود پاگل ہیں .... ہیں نا تبسم! .... کوئی شوق سے تو پاگل نہیں ہو جاتا۔"

"تم پاگل نہیں ہو"۔ میں نے زور دے کر کہا۔ "میں نے تم میں پاگلوں والی کوئی بات نہیں دیکھی"۔ میں نے اُس کے چہرے پر چمک دیکھی جیسے میں نے اُس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

"میں تمہیں اپنے دل کا روگ سنا دیتی ہوں"۔ اُس نے کہا۔ "پھر مجھے بتانا پاگل کون ہے"۔ اُس نے پنسل سکیچ والا کاغذ اٹھا کر میرے آگے رکھ دیا اور بولی۔ "جس وقت مجھے یہ آدمی مل جائے گا میں اُسی وقت نارمل ہو جاؤں گی لیکن میرے گھر والے کہیں گے کہ اگر میں پہلے پاگل نہیں تھی تو اب پاگل ہو گئی ہوں کیونکہ میں اس آدمی کے ساتھ اس گھر سے نکل جانا چاہوں گی۔"

"یہ کون ہے؟"۔ میں نے پوچھا۔ "کہاں ہے؟"

"یہی تو میرا روگ ہے"۔ اُس نے جواب دیا۔ "مجھے اس کی شکل و صورت بھی یاد نہیں۔ اس کا چہرہ بناتی رہتی ہوں۔ دو سالوں سے بنا رہی ہوں۔ جب کوئی سکیچ مجھے اس جیسا لگتا ہے تو پورا پورا دن اور کبھی رات کو بھی اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ پھر وہم ہو جاتا ہے کہ وہ اس سکیچ جیسا نہیں تھا۔ اسے پھاڑ کر ایک اور بنانے بیٹھ جاتی ہوں۔"

اب مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ کسی پیچیدہ نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے مجھے شک SCHIZOPHRENIA کا ہُوا تھا۔ یہ بڑا نامراد نفسیاتی مرض ہے۔ مریض حقیقی دُنیا سے لاتعلق ہوکر اپنے ذہن میں اپنی پسند کی دُنیا آباد کر لیتا ہے جسے وہ حقیقی سمجھتا ہے۔ وہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ یہ تصوّر ہے۔ اس کیفیت سے اُسے بیدار کیا جاتے تو اُس کا ردِّ عمل بڑا ہی شدید اور خطرناک ہوتا ہے۔ بعض مریض تشدّد پر اُتر آتے ہیں اور بعض کا ردِّ عمل ایسا ہوتا ہے کہ اُن پر خاموشی طاری رہتی ہے۔ ان کے ساتھ جیسا بھی سلوک کرو وہ خاموشی نہیں توڑتے۔ تنہا چھوڑو تو وہ پھر اپنے تصوّروں کی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ باتیں کرتے مُسکراتے اور ہنستے ہیں۔

یہ مریضہ بھی مجھے اسی مرض میں مبتلا نظر آئی۔ اُس نے اپنے تصوّروں میں ایک ایسے آدمی کو آباد کر لیا تھا جس کے متعلّق اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کون ہے اور کہاں ہے اور اُس کے چہرے کے متعلّق وہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ کیسا ہے۔

"تم تنہائی میں کسی کے ساتھ باتیں کیا کرتی ہو؟"

"کرتی ہوں"— اُس نے جواب دیا —"اگر اکیلے بولتی نہ رہوں تو میں مر جاؤں۔"

"اس کمرے کو حقیقی سمجھتی ہو؟"— میں نے اسے کہا —"تم نے اپنے تصوّر میں کوئی اور کمرہ آباد کر رکھا ہے؟"

"نہیں"— اُس نے جواب دیا —"میں تمہیں کوٹھی کے دوسرے کمرے دکھاؤں تو تم حیران رہ جاؤ اور مجھے اس کوٹھی کی نوکرانی سمجھو جو اس سادہ اور غریبانہ کمرے میں رہتی ہے۔ میں نے اس کمرے کو حقیقت کا روپ خود دیا ہے۔ باقی سب بناوٹ ہے۔ اس کوٹھی میں پاکستانی یورپین رہتے ہیں .... پاکستانی ہپّی کہہ لو انہیں۔ میرا کمرہ پاکستانی ہے۔ ان ہپّیوں نے جو اس کوٹھی میں رہتے ہیں، میری نسائیت کا وقار مجروح کر دیا ہے۔"

پاگل .... پاگل .... بلاشک وشبہ پاگل!

"تم پریشان ہو گئی تبسّم!"— اُس نے اُداس سی مسکراہٹ سے کہا —"میں بڑے خوشنما قید خانے میں قید ہوں۔ میں اشارہ کروں تو اس کمرے میں سَو سَو کے نوٹ ردّی کاغذوں کی طرح اُڑنے لگیں۔ میں کسی بھی آدمی کو اپنے پاس بلانا چاہوں وہ بلا روک ٹوک یہاں آ جاتے۔ باہر کی شراب آسکتی ہے یہاں .... تم کسی اور طبقے کی خاتون ہو۔ تمہاری پریشانی اور حیرت بجا ہے۔ تمہارے ہاں عصمت اور آبرو کا تصوّر کچھ اور ہے۔ ہمارے ہاں یہ تصوّر دقیانوسیّت اور پسماندگی کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ تم چھاتیوں کو شرم اور حیا کی نشانی سمجھ کر ان پر دوپٹہ ڈالے رکھتی ہو۔ میں جس کلاس کی لڑکی ہوں اس کلاس کی لڑکیاں چھاتیوں کو سامنے کر کے اور اُوپر سے کچھ حصّہ ننگا کر کے رکھتی ہیں پھر لڑکیاں کوشش کرتی ہیں کہ اُن کی چھاتیاں لڑکوں کے جسموں کے ساتھ لگیں۔"

میں سٹپٹا گئی۔ اُسے کہا کہ بات کر ہی رہی ہو تو سیدھی بات کرو اور مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔

اس نے مجھے "سیدھی بات" سنا دی جو میں آج دو سال بعد لکھ رہی ہوں تو بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔

"یہ محل جس میں مَیں پیدا ہوئی ہوں، میرے سامنے تعمیر ہُوا ہے"— اُس نے کہا —"اس سے پہلے یہ معمولی سی کوٹھی تھی۔ جوں جوں ڈیڈی کا عہدہ اور سرکاری رُتبہ بڑھتا گیا یہ کوٹھی پھیلتی گئی اور اس کی شکل وصورت بدلتی گئی۔ اِردگرد زمین ابھی خالی تھی۔ وہ نقد قیمت پر کوٹھی میں شامل ہوتی گئی، پھر یہ محل بن گیا۔ ہماری جو تہذیب تھی، جو مذہب تھا اور ہماری جو اصلیت تھی وہ پُرانی کوٹھی کے ملبے میں دب گئی اور اس محل میں ہپّی کلچر آ گیا۔ میں اور میرے دو بھائی بڑے ہو رہے تھے اور ہماری ماں چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ تمہارے گھر میں اتنے ردّی کاغذ نہیں ہوں گے جتنے اس محل میں سَو سَو کے نوٹ ہوتے ہیں۔ کبھی یُوں لگتا ہے جیسے میں اور میرے بھائی نوٹوں کے ڈھیر میں سے پیدا ہوتے ہیں ....

”حیران نہ ہو تبسم! ہمارے گھر میں ٹکسال نہیں لگی ہوتی۔ ہمارے گھر میں جو کرنسی آتی ہے وہ جعلی نہیں ہوتی۔ یہ سب رشوت کی رقم ہوتی ہے اور یہ معمولی سی رشوت نہیں، ہزاروں اور لاکھوں کی ہوتی ہے۔ تم سائیکالوجی پڑھی ہوئی ہو۔ انسان کی فطرت کو مجھ سے زیادہ سمجھتی ہوگی۔ دولت انسان کا وہی حال کر دیتی ہے جو چرس، ہیروئن اور شراب کرتی ہے۔ دولت حلال کی کمائی ہوئی ہو جس میں کمانے والے کا خون پسینہ شامل ہو تو انسان اس کی قدر کرتا ہے یا یہ ضرور کرتا ہے کہ ہماری طرح رقم اُڑاتا نہیں۔ بغیر محنت کے دولت برسنے لگے تو تم سمجھ سکتی ہو کہ انسانوں کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔ ایک تو اس دولت کو اسی طرح اُڑنا ہوتا ہے جس طرح اُڑتی ہوئی آتی ہے اور دوسرے یہ کہ اُوپر خدا ہے جو سزا بھی دیتا ہے مگر ہمارے باپ کے گناہ کی سزا خدا نے مجھے دی .... میں سزا کی ہی حقدار تھی کیونکہ میں جانتے بوجھتے ہوتے خدا کو بھول گئی تھی ....

”اس دولت نے کوٹھی کو محل بنایا اور ہم اپنی اصلیت بھلا بیٹھے۔ یہاں موقع بے موقع پارٹیاں اُڑنے لگیں۔ پھر میں الگ اور میرے بھائی الگ اپنے دوستوں کو پارٹیاں دینے لگے۔ میرے ڈیڈی اور ممی پر یہی بھوت سوار رہنے لگا کہ روپوں کی جو ندی بہتی آ رہی ہے یہ رکنے نہ پائے۔ میرے والدین نے میرے اور میرے بھائیوں کے دماغوں میں یہ ڈال دیا کہ ہم بہت اُونچے لوگ ہیں اور جو لوگ باہر سڑکوں پر آتے جاتے نظر آتے ہیں یہ ہم سے کمتر ہیں۔ پھر صاف الفاظ میں تو نہیں، عملی طور پر اور اشاروں میں ہمارے دماغوں میں یہ بھی ڈالا گیا کہ پاکستان پسماندہ اور جاہل ملک ہے اور ہم پسماندہ اور جاہل نہیں۔ مطلب صاف تھا کہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم پاکستان میں پیدا ہوتے ہیں، ہم پاکستانی نہیں ....

”تم نے فلموں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی دھما چوکڑی دیکھی ہوگی جسے ڈانس کہتے ہیں۔ یہ ڈانس انگریزی موسیقی پر کیا جاتا ہے۔ یہ ہپّی کلچر ہے۔ یہ ہمارے گھر میں بھی آگیا۔ میرے بھائیوں کے دوست آتے تو ان کے ساتھ

دو تین لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ ہم سب انگریزی موسیقی کا کیسٹ لگا کر وہی ناچ ناچا کرتے تھے جو دھما چوکڑی بھی نہیں بلکہ پاگلوں جیسی حرکتیں ہوتی ہیں۔ کمر ٹیڑھی میڑھی کرتے رہنا اور کولہے مٹکانا اور چھاتیوں کو زور زور سے ہلانا — اس پاگلوں جیسے ناچ کے دوران لڑکے اور لڑکیاں آپس میں بیہودہ حرکتیں بھی کرتے تھے ....

”میں تمہیں مکمل طور پر نہیں سنا رہی کہ میں کس طرح اس تہذیب میں ڈوبتی چلی گئی جو دراصل تہذیب ہے ہی نہیں۔ انسان جب غلط راستے پر چل پڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہی راستہ سیدھا ہے تو اس کی واپسی کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ بدی کا راستہ غلط ہے لیکن بدی میں سرور اور لذت ہے۔ اس راستے پر چل پڑنے والے اسے غلط نہیں کہا کرتے ....

”تم نے ہپّی دیکھے ہیں نا! ان کے ساتھ جوان لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ لڑکیاں آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ یہ لوگ چرس پیتے ہیں۔ ان کے ہوٹل الگ تھلگ ہیں جہاں یہ ٹھہرتے ہیں۔ چرس کے نشے میں بدمست ہو کر ننگے ناچتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے ملک کے دھتکارے ہوئے لوگ ہیں لیکن یہاں آکر انہوں نے ایک کلچر پیدا کر دیا ہے اور ہم جیسے پاکستانی اس کلچر میں رنگے گئے ہیں۔ میرے طبقے کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انہی کی طرح ہپّی بن گئی ہیں۔ میں اور میرے بھائی بھی اسی کلچر کے شیدائی ہو گئے۔ ہم نے انگریزی موسیقی کے ٹیپ اکٹھے کرنے شروع کر دیئے اور اس پر ہمارے ناچ ہوتے تھے ....

”ہم انگریزی بولنے لگے اور ہمارے لئے پاکستان ایک مذاق بن کے رہ گیا۔ عام لوگوں کو، یعنی تمہارے اور اس سے نیچے طبقے کو ہم اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے ساتھ بات بھی کی جائے۔ ہمارے گھر میں دو کاریں ہیں۔ کوئی ایک سال ہوا، میرا بھائی گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ پیچھے میں اپنے بھائی کے ایک دوست کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ہم نے دو سگریٹ خریدے تھے جن میں چرس بھری ہوتی تھی۔ وہ غریبوں کے بچے ہوتے ہیں جنہیں چرس کے سگریٹ بیچنے والے تھوڑی سی اُجرت پر اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ

ہم جیسوں کی کار ایک جگہ رُکتی ہے۔ بھکاری سا ایک بچہ کار کے قریب جاتا ہے۔ کار والے اسے اشارہ کرتے ہیں وہ چرس والا سگریٹ لا دیتا ہے ....

"میرا بھائی کار چلا رہا تھا۔ رات تھی۔ ہم قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔

اچانک ایک آدمی کار کے آگے آگیا۔ کار اُس سے ٹکرائی۔ میرے بھائی نے گاڑی روک لی۔ اس آدمی کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ اسے گاڑی میں ڈال کر یہاں لے آتے۔ وہ غریب سا آدمی تھا۔ ہوش میں تھا اور رو رہا تھا۔ میرے بھائی نے اُسے کہا کہ ہم اُسے ہسپتال داخل کرا دیں گے لیکن وہ رپورٹ نہ کرے۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کچھ دے دو۔ ہم نے پوچھا کہ وہ کتنی رقم لے گا۔ اُس نے سوچ سوچ کر کہا، ایک ہزار روپیہ دے دو....

"میں نے ہنس کر انگریزی میں کہا — 'یہ بدبخت ایک ہزار کو بہت بڑی رقم سمجھتا ہوگا' — میرے بھائی نے اُسے دو ہزار روپیہ دے دیا اور اُسے ایک سرکاری ہسپتال میں لٹا آتے۔ وہاں کے عملے کو تین سو روپیہ دے دیا.... اُس وقت تو میں ہنس پڑی تھی مگر اب سوچتی ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس ملک کے لوگ اپنے آپ کو کتنا سستا سمجھتے ہیں۔ انہیں نہ اپنی قدر کا پتہ ہے نہ اپنی قیمت کا۔ یہاں انسان ارزاں ہیں ....

"میرے طبقے کی نظر میں تو یہ مویشی ہیں۔ ہم ان مویشیوں سے الگ تھلگ اپنی ہپی لینڈ بناتے ہوتے تھے۔ جب ہمارے طبقے کے نوجوان اخلاق اور کردار سے آزاد ہو گئے تو یہاں ایسے ہوٹل کھُل گئے جن کے الگ کمرے ہیں اور ان کا استعمال مخصوص ہے۔ مخصوص استعمال کو تم ضرور سمجھتی ہوگی۔ تم کالج اور یونیورسٹی میں پڑھتی رہی ہو۔ کوئی بچّی تو نہیں ہو تم....

"میں ایک رات ایسے ہی ایک ہوٹل میں گئی۔ اُس رات ہمیں ناچ والا ہنگامہ کرنا تھا۔ سب لڑکے اور لڑکیاں اُن والدین کی اولاد تھی جن کے ہاں اُڑانے کے لئے بے شمار دولت تھی۔ پہلے کھانے پینے کا سلسلہ چلتا رہا پھر امریکی نشے شروع ہوتے اور ڈانس بھی شروع ہو گیا۔ یہ ہوٹل کا تہہ خانہ تھا۔ ایک ہال تھا اور کچھ

کمرے بھی تھے ....

"نشہ دماغوں کو چڑھ گیا تھا۔ اپنے پرائے کی تمیز ختم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک جوڑے کو دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکی لڑکا تھے۔ وہ ایک کمرے میں چلے گئے اور پندرہ بیس منٹ بعد باہر آتے۔ مجھے معلوم تھا وہ کمرے میں کیوں گئے تھے۔ میرے جسم میں کمرے میں جانے کی خواہش بھڑک اُٹھی ....

"میں نے اپنے ایک بوائے فرینڈ کو ساتھ لیا اور گلی سی میں چلی گئی جس میں آمنے سامنے دو کمرے تھے۔ میں ان کمروں سے واقف تھی۔ کئی بار ان میں جا چکی تھی۔ اندر بڑے اچھے پلنگ تھے اور مدھم سی نیلی روشنی رومان انگیز تھی۔ میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے دروازہ بند کر دیا اور میں پلنگ پر گر پڑی۔ ناچ اور نشے نے جسم توڑ دیا تھا۔ میرا فرینڈ میرے اُوپر گرا اور ہم دونوں انسانوں سے حیوان بن گئے ....

"میرا فرینڈ کمرے سے نکل گیا اور میں پلنگ پر پڑی رہی۔ میرا جسم ٹوٹ گیا تھا۔ آٹھ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ کوئی ہمارا ہی ساتھی ہو سکتا تھا جو نشے میں انگریزی گانا گاتا آ رہا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آگیا۔ میں نے اتنی مدھم روشنی میں بھی پہچان لیا۔ وہ میرا بھائی تھا۔ میں ابھی تک نیم برہنہ حالت میں تھی۔ میں فوراً اُٹھی لیکن میرے بھائی نے لپک کر میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے پلنگ پر گرا دیا....

"مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں تھا کہ اس حالت میں دیکھ کر وہ مجھے قتل کر دے گا۔ اُسے سب کچھ معلوم تھا۔ میں اُس کے متعلق سب کچھ جانتی تھی لیکن اُس نے ایسی حرکت کی جس سے میں سمجھی کہ وہ نشے میں ہے اس لئے مجھے پہچان نہیں سکا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اُس کی بہن ہوں۔ اُس نے نشے میں جھومتی لڑکھڑاتی زبان میں کہا — 'میں نے پہچان لیا ہے' — اور وہ میرے اُوپر گر پڑا۔ میں خود نشے میں تھی لیکن نشہ اُتر گیا۔ میں نے بھائی سے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی لیکن وہ جیت گیا۔ میرا جسم پتھر بن گیا۔ وہ ہنستا ہُوا کمرے سے نکل گیا....

"میں گھر آگئی۔ مجھے اُمید تھی کہ کل بھائی کا نشہ اُترے گا تو وہ میرا سامنا

نہیں کرسکے گا، لیکن اُس نے میرا سامنا بھی کیا اور بے حیائی سے کہا کہ مجھے محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ خون کے رشتے بے معنی ہوتے ہیں .... لیکن میں سب معانی سمجھ گئی تھی۔ میری ابھی کوئی حس زندہ تھی۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ میری کیفیت کیسی کیسی ہوئی۔ مجھے اپنے جسم سے بدبُو آنے لگی اور مجھے ہر کسی سے نفرت ہونے لگی۔ میں نے اپنے ماں باپ کو نہ بتایا۔ اپنے آپ کو اس کمرے میں قید کرلیا۔ کبھی میں رونے لگتی تو روتی ہی رہتی۔ چُپ لگتی تو ایسی کہ گھر کے سب لوگ مجھے بلاتے۔ میں بولنے کی خواہش کے باوجود نہ بول سکتی ...

"اس بھائی نے میری حوصلہ افزائی کی لیکن اس سے تو مجھے اتنی نفرت ہوگئی تھی کہ اس کی صورت دیکھ کر میرا جسم کانپنے لگتا تھا۔ میں نے اس کمرے کی ڈیکوریشن باہر پھینک دی۔ تصویریں اُتار کر پھینک دیں اور اسے اپنے مُلک جیسا کمرہ بنا دیا۔ یہاں سے ڈاکٹروں کی آمدورفت شروع ہوگئی ہے۔ مجھے زبردستی دوائیاں کھلائی گئیں۔ ذہنی امراض کا ایک سپیشلسٹ بھی آیا۔ اُس نے بھی گولیاں لکھ دیں جو مجھے سلاتے رکھتی تھیں۔ پھر یہ ڈاکٹر آیا جس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی نہ بتایا کہ میری بیماری کیا ہے۔ میں ان کی گولیاں کھاتی رہی۔ یہ مجھے حقیقی دنیا سے لاتعلق رکھتی تھیں....

"پھر ایسے ہُوا کہ میں ان ڈاکٹروں سے تنگ آگئی اور گولیاں چھوڑ دیں۔ تمہارے ڈاکٹر صاحب اپنے مریضوں کو یہی گولیاں دیتے ہوں گے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ مریض جب یہ گولیاں چھوڑ دیتا ہے تو اُس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ شاید تمہیں بھی معلوم ہو۔"

مجھے معلوم تھا۔ ہمارے ملک میں یہ گولیاں جنہیں SEDATIVE اور TRANQUILISER کہا جاتا ہے، بے تحاشا استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور VALIUM ہے۔ یہ دماغ کو سلا دیتی اور ذہن کو سکون دیتی ہیں۔ آپ DEPRESSION سے تو واقف ہوں گے۔ یہ لفظ اتنا عام ہو گیا ہے کہ مزاج میں ذراسی برہمی یا اُداسی آجاتے تو کہتے ہیں ڈیپریشن ہو گئی ہے۔ اکثر لوگ اپنے آپ ویلیم کی گولی لے لیتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ

مزاج کیوں بگڑا ہے۔ یہ گولیاں مریض کے لئے فرار مہیا کرتی ہیں اور ڈاکٹر کے لئے یہ بڑا ہی آسان علاج ہے۔ تشخیص کی زحمت سے ڈاکٹر بچ جاتا ہے۔

پاکستان میں سائیکاٹرسٹ (نفسیاتی امراض کے ڈاکٹر) موجود ہیں لیکن وہ بھی پانچ سات منٹ مریض کی بات سُن کر ذہنی سکون اور نیند کی گولیاں دے دیتے ہیں۔ ان گولیوں کے اثرات بڑے ہی بیہودہ ہوتے ہیں۔ ان کے استعمال کے دوران مریض سویا رہتا یا غنودگی کی حالت میں رہتا ہے۔ وہ جذباتی لحاظ سے مُردہ ہو جاتا ہے۔ وہ دُنیا کو دیکھتا ہے، چلتا پھرتا ہے لیکن لاتعلق رہتا ہے۔ جب مریض یہ گولیاں چھوڑتا ہے تو اُس کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ مزاج میں غصہ آجاتا ہے۔ بعض کو واہمے نظر آنے لگتے ہیں جنہیں HALLUCINATION کہا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہ انسان حقیقی زندگی سے لڑتا جھگڑتا اور بھاگتا ہے، یا یُوں کہہ لیں کہ وہ حقیقت کی زندگی میں ADJUST نہیں ہوتا، یا ہونا نہیں چاہتا۔

اسی مرحلے میں یہ مریضہ آگئی تھی جس کی میں عجیب وغریب رام کہانی سُن رہی تھی۔ وہ اپنی کیفیت اچھی طرح بیان نہیں کرسکتی تھی۔ اُس نے کسی بھی ڈاکٹر کو نہ بتایا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ یعنی مرض کا باعث نہ بتایا۔ ڈاکٹر اسے ڈیپریشن سمجھتے رہے۔ اگر وہ بتا بھی دیتی تو پھر بھی ڈاکٹر اسے یہی گولیاں دیتے اور حقیقت سے اس کا رشتہ توڑے رکھتے۔ اس کا علاج نفسیاتی طریقے سے ہونا چاہیئے تھا جس میں نفسیات کا ڈاکٹر کم از کم ایک گھنٹہ روزانہ مریض کے پاس بیٹھتا، اس کی سنتا اور اپنے تیکنیکی انداز سے باتیں کرکے اس کا ذہن صاف کرتا ہے مگر اس مریضہ کے "ممی اور ڈیڈی" اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ دولت سے مرض اور موت کو بھگایا جاسکتا ہے۔ وہ علاج پر اندھا دُھند خرچ کرتے رہے۔

مریضہ نے غصے اور انتقام میں آکر گولیاں چھوڑ دیں۔ اُس کا ذہن عادی ہوچکا تھا۔ یکلخت گولیاں چھوڑنے سے ذہن بے قابو ہوگیا اور وہ بڑی ہی تلخ اور شرمناک حقیقت جس نے اسے مریض بنایا تھا اس کے سامنے

آ گئی۔ ایک آگ تھی جو اسے جلانے لگی اور کبھی وہ یوں محسوس کرتی جیسے بڑے
تیز اور بڑے گہرے پانی میں ڈوب رہی ہو۔ اُسے اس محل سے اور اس
محل میں رہنے والوں سے نفرت ہوگئی اور اپنے آپ کو ان کا قیدی سمجھنے لگی۔

"میں نے سوچا کہ اس زندگی سے مرجانا اچھا ہے"۔۔۔ اُس نے اپنی ساری
ذہنی کیفیت بیان کر کے کہا ۔۔۔"ایک رات اس کوٹھی میں خاموشی تھی۔ سب
سو گئے تو میں باہر نکل گئی۔ نیند تو مجھے آتی نہیں تھی۔ بہت دنوں سے میں
مسلسل جاگ رہی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میں باہر جارہی ہوں۔ یہ بھی دیکھ
رہی تھی کہ چاندنی ہے، لیکن میں ایسے جارہی تھی جیسے کوئی خواب میں
چل رہا ہو۔ ریلوے لائن دُور نہیں تھی۔ وہ میری منزل تھی۔ میں وہاں تک
پہنچ گئی اور ریل گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے سکون اور اطمینان سے
فیصلہ کیا تھا کہ گاڑی قریب آجائے گی تو اپنے آپ کو پٹڑی پر پھینک دوں گی"۔

"تمہیں گزری ہوئی ساری زندگی یاد آئی ہوگی"۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔"تم
روئی بھی ہوگی"۔

"نہیں۔ بالکل نہیں"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔"مجھے وہ سکون ملا جس نے
میرے سارے دُکھ دُور کر دیئے۔ اتنی خوشی مجھے کبھی بھی نہیں ملی تھی۔ میں
اس دُنیا پر لعنت بھیج کر جارہی تھی جس میں دولت نے انسانوں کو اندھا اور
بہرہ کر رکھا تھا کہ انسانوں کو خریدا جاتا ہے، عورت کی عصمت خریدی جاتی ہے۔
ایک طرف بھوک ہے، دوسری طرف کُتے بھی دودھ پیتے ہیں، بھائی کو بہن کی
عصمت کا خیال نہیں"۔۔۔ اُس نے میری طرف جُھک کر کہا ۔۔۔"عورت کو جہاں
پھینک دو وہ اپنی عصمت اور آبرو کا تحفظ کرتی ہے۔ مرد حیوان ہے ۔۔۔۔ تبسّم!
تم بہت زیادہ پڑھی ہوئی ہو۔ مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ میں نے جو سمجھا ہے وہ
بتاتی ہوں۔ میں جب اپنی کلچر میں ڈوبی ہوئی تھی تو میں مذہب اور پاکستانیت
کو پسماندگی سمجھتی تھی۔ محض بے معنی لیکن مجھے جب چوٹ پڑی، یا اس طرح سمجھو
کہ میں نے ایک چوٹ محسوس کی تو میرے اندر ایک احساس پیدا ہوگیا کہ
کوئی ایسی طاقت ہے جس نے انسان کو اپنے قبضے میں رکھا ہوا ہے اور
انسان اس سے باغی نہیں ہوسکتا۔ ہوگا تو سزا پائے گا۔ سوچتے سوچتے خیال

آیا کہ یہ طاقت خُدا ہی ہوسکتا ہے۔ شاید مذہب اسی کو کہتے ہیں جس سے
آزاد ہو کر انسان کی یہ حالت ہوجاتی ہے جو میری ہوگئی ہے ۔۔۔۔

"میں ریل گاڑی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ تم نے شاید دیکھا ہو،
ریلوے لائن یہاں سے دُور نہیں۔ جہاں میں کھڑی تھی وہاں ویرانہ سا تھا۔
تھوڑی دُور غریبوں کی جُھگیاں اور جھونپڑیاں ہیں ۔۔۔۔ ایک آدمی آہستہ آہستہ
چلتا میری طرف آرہا تھا۔ میرے قریب آکر وہ اور آہستہ ہوگیا۔ چاندنی میں ہم
ایک دوسرے کے چہرے دیکھ سکتے تھے۔ وہ جوان آدمی تھا۔ کپڑوں سے
غریب لگتا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے مجھے غور سے
دیکھا اور آگے چلا گیا لیکن گھوم گھوم کر مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے اس سے ڈر آنے
لگا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان غریبوں اور مزدوروں پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ یہ ہر طرح
کا جُرم کرتے ہیں اور جیل خانے انہی لوگوں سے بھرے ہوتے ہیں ۔۔۔۔

"یہ آدمی مجھے خراب کرسکتا تھا۔ وہ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا اور ایک
بار اُس نے رُک کر بھی مجھے دیکھا۔ میں دعا کرنے لگی کہ گاڑی جلدی آجائے۔
میں نے بھاگنے کی نہ سوچی ۔۔۔۔ خُدا نے میری دعائیں لیں اور دُور سے مجھے
انجن کی بتی نظر آنے لگی۔ وہ آدمی رُک گیا۔ وہ مجھ سے بیس قدم دُور تھا۔
شاید سوچ رہا تھا کہ مجھ پر کس طرح حملہ کرے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ گاڑی مجھ
تک پہلے پہنچتی ہے یا یہ آدمی۔ مجھے دونوں میں سے ایک کا شکار ہونا تھا۔۔۔۔

"وہ وہیں کھڑا رہا اور کراچی کی طرف سے آنے والی گاڑی تیز رفتار
سے قریب آگئی۔ میں پٹڑی کے قریب ہوگئی۔ میری توجہ اس مشکوک آدمی
سے ہٹ گئی۔ انجن ایک چٹان کی طرح اُڑتا آیا اور جب مجھ سے چند قدم
دُور رہ گیا تو میں لائن پر گرنے کے لئے آگے بڑھی مگر پیچھے سے مجھے
کسی نے اتنی مضبوطی سے پکڑ لیا کہ میں آگے نہ بڑھ سکی۔ ریل گاڑی قیامت کا
شور بپا کرتی گزر گئی۔ میں نے دیکھا کہ مجھے اُسی آدمی نے اپنے بازوؤں میں
جکڑ رکھا تھا۔ میں تڑپنے لگی۔ اُس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں چلّا چلّا کر اُسے
کوسنے لگی ۔۔۔۔

"اُسے شاید شک ہو گیا تھا کہ میں اُس پر شک کر رہی ہوں۔ میں نے باتیں کچھ ایسی ہی کہہ دی تھیں۔ اُس نے دبی ہوئی سی آواز میں کہا کہ بی بی! میں نے تمہیں مرنے سے بچایا ہے اور تم مجھے گالیاں دیتی ہو اور میری نیت پر شک کرتی ہو۔ میں سمجھ گئی کہ اُس کی نیت بُری نہیں۔ میرا جسم یکلخت بے جان ہو گیا۔ میں بیٹھ گئی اور میں بے قابو ہو کر رونے لگی۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور سادے سادے سے الفاظ میں مجھے حوصلہ دینے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس نے مجھے موت سے بچا کر کوئی نیکی نہیں کی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس غم سے مر رہی تھی۔ میں نے اُسے نہ بتایا....

"اُس نے کہا کہ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ تم جوان لڑکی ہو۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تم خود سیانی ہو، جانتی ہو کیا ہو جاتا.... میں سمجھ نہ سکی کہ ایک تو میں اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ اس کا منہ نوچنے کو تیار ہو گئی تھی، پھر اچانک ایسا ہُوا کہ میں اس طرح بُجھ گئی جیسے میں اس جوان اور غریب آدمی کی پناہ میں پڑی ہوں اور یہ مجھے جہاں بھی لے جانا چاہے گا میں اسے نہیں روک سکوں گی۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ اُس نے کہا، چلو میرے ساتھ۔ میں اُس کے ساتھ چل پڑی....

"راستے میں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیوں خودکشی کر رہی تھی۔ میں نے اُسے ٹالنے کے لئے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں جا رہا تھا۔ اُس نے کہا — 'میں بھی تمہاری طرح اپنی جان لینے آیا تھا۔ مجھے بھی اسی گاڑی کا انتظار تھا جس کے انتظار میں تم کھڑی تھیں لیکن تم نے میری جان بچا لی' — میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیوں اپنی جان لے رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا باپ مر چکا ہے۔ اُس کی دو جوان بہنیں ہیں۔ ماں بیمار ہے۔ دو چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ ایک فیکٹری میں ملازم ہے لیکن بہنوں کی شادی اور بھائیوں کی تعلیم کی وہ کیا سوچے گا، انہیں اتنی روٹی بھی نہیں دے سکتا کہ ان کے پیٹ بھر جائیں۔ ماں کا علاج الگ ہے۔ وہ اتنا تنگ آ گیا تھا کہ خودکشی کے لئے ریلوے لائن پر چلا گیا....

"اُس نے دھیمی دھیمی سی آواز میں کہا — 'تمہیں دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ لڑکی کسی بڑے گھر کی ہے۔ اس کا یہاں کیا کام ہو سکتا ہے۔ تم امیر لوگ کسی اور وجہ سے خودکشی کرتے ہو اور ہم غریب لوگ کسی اور وجہ سے اپنی جان لیتے ہیں۔ تم بُرا جانو گی۔ مجھے معاف کر دینا۔ امیر لڑکی اُس وقت خودکشی کرتی ہے جب وہ شادی سے پہلے ہی ماں بننے والی ہو جاتی ہے۔ امیری انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور قدرت صرف ایک تھپڑ لگاتی ہے اور آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ میں نے تمہیں ایسی ہی لڑکی سمجھا۔ میں آگے جا کر رُک گیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم خودکشی کے لئے آتی ہو۔ میرے دل میں خُدا نے یہ ارادہ ڈال دیا کہ تمہیں بچاؤں گا۔ میرے دل سے خودکشی کا ارادہ نکل گیا۔ میرا شک صحیح نکلا۔ گاڑی آئی اور تم آگے ہوئیں اور میں نے تمہیں پکڑ لیا'....

"میں نے اُس سے پوچھا کہ اب وہ کیا کرے گا؟ کیا وہ مجھے گھر پہنچا کر ریلوے لائن پر آ جائے گا تو اس نے کہا — 'نہیں.... تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی بہنوں کا خیال آ گیا تھا۔ میں مر گیا تو وہ بھوکی اور ننگی رہ جائیں گی۔ زمانہ بڑا خراب ہے بی بی! تم خود سیانی ہو۔ میری بہنیں بھوک سے تنگ آ کر اپنا آپ بیچ ڈالیں گی۔ ماں کو کفن بھی نہیں ملے گا۔ چھوٹے بھائی آوارہ ہو جائیں گے۔ مجھے خُدا نے اشارہ دیا ہے کہ زندہ رہو۔ میں اب زندہ رہوں گا۔ ایک انسان کی جان بچا کر مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے خُدا نے میرے ساتھ وعدہ کر دیا ہے کہ وہ مجھے اس کا اجر دے گا'....

"وہ بڑے اطمینان سے نرم سی آواز میں بولتا جا رہا تھا، اور میں سوچ رہی تھی کہ اس شخص کو خُدا پر کتنا اعتماد اور بھروسہ ہے اور اس سے اُسے کتنا اطمینان ہے۔ میں اس اطمینان سے محروم ہوں۔ پھر بھی میرے دل میں یہ ڈر موجود رہا کہ یہ آدمی مجھے دھوکے میں کہیں اور لے جا رہا ہے۔ تم جانتی ہو کہ میری ذہنی حالت کیا تھی، لیکن وہ میری راہنمائی میں چل رہا تھا۔ مجھے اپنی کوٹھی دکھائی دینے لگی۔ پھر ہم کوٹھی کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ میں

نے اُسے کہا کہ اب میں اندر چلی جاؤں گی۔ اس نے کہا "تم نے مجھے غم نہیں بتایا۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ خُدا کو یاد کرو۔ وہ غم دُور کر دیا کرتا ہے'....

"میں نے اُسے کہا "ذرا ٹھہرو۔ میں تمہیں کچھ دینا چاہتی ہوں۔ دو تین ہزار روپیہ لے جانا" — وہ عجیب سی ہنسی، ہنس پڑا اور چلا گیا۔ میں کھڑی دیکھتی رہی اور وہ اگلا موڑ مُڑ کر غائب ہو گیا.... مجھے سکون سا محسوس ہونے لگا۔ میں تو اس آدمی سے ڈر گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ انسان جو غربت سے تنگ آ کر خودکشی کرنے گیا تھا وہ دو تین ہزار روپے کے انعام پر طنزیہ ہنسی ہنس کر چلا گیا تھا....

"چھ مہینے گذر گئے ہیں۔ میں اُسے ڈھونڈ رہی ہوں۔ کئی بار انہی جھگیوں کے پاس جا رُکی جن کے قریب سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔ وہ ان جھگیوں میں ہی رہتا ہو گا۔ میں نے کسی سے پُوچھا نہیں۔ اُمید تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر پہچان لے گا مگر وہ نہیں مِلا۔ اب مایوس ہو گئی ہوں۔ اُسی کی تصویر بناتی رہتی ہوں اور اُس کے ساتھ باتیں کیا کرتی ہوں۔ وہ مِل گیا تو میں اُس کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ یہی میرے مرض کا علاج ہے۔"
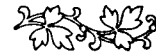
اُسی ریوالور کی گولی

انسان کی فطرت ایک سمندر ہے جس کی تہہ کے سارے راز ابھی تک کوئی نہیں پا سکا۔ "حکایت" کے شمارہ جنوری ۱۹۸۲ء میں محترمہ نسیم اختر کی کہانی "خون کا پیار" پڑھی تو مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جن ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرتی ہوں، میں ان کے پاس نئی نئی آئی تھی۔ نفسیات کا ایک نکتہ سمجھانے کے لئے اُنہوں نے یہ واقعہ مثال کے طور پہ مجھے سنایا تھا۔ یہ کیس ان کا اپنا نہیں، ان کے ایک دوست ڈاکٹر کا تھا۔

وہ ڈاکٹر فزیشن تھا لیکن نفسیات کی بھی خاصی سُوجھ بُوجھ رکھتا تھا۔ اُس وقت بیماریاں اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ مریضوں کی کمی کی وجہ سے ڈاکٹر ہر مریض کو پوری تسلّی اور اطمینان سے دیکھتے تھے۔ یہ ڈاکٹر جن کا میں کیس سنانے لگی ہوں، اگر ضروری سمجھتے تو مریض کی نفسیات کا بھی جائزہ لیتے تھے۔ ان کے پاس بیس سال کا ایک نوجوان لایا گیا جو دراصل نفسیاتی مریض تھا۔ میں اس کا فرضی نام ظہیر لکھوں گی۔ اصل نام کا مجھے علم نہیں۔

ظہیر امیر خاندان کا نوجوان تھا۔ زمین بے شمار تھی۔ اس اتنے بڑے شہر میں ظہیر کے باپ نے ظہیر اور اس کی دو بہنوں کی تعلیم کی خاطر کوٹھی بنائی تھی۔

اُس وقت بڑے شہروں میں ابھی کالونیوں کا کاروبار شروع نہیں ہُوا تھا لیکن آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس کے مطابق شہروں کے اِردگرد کے جنگلوں اور کھیتوں میں کوٹھیاں کھڑی ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ اس شہر میں جس کی یہ کہانی ہے، ایک سے ایک عالیشان کوٹھیوں کا نیا شہر آباد ہو رہا تھا۔ دیہاتی علاقوں کے بڑے بڑے جاگیرداروں نے بھی یہاں آ کر دو

دو، تین تین اور چار چار کنال کی کوٹھیاں بنا لیں۔ ہم سنا کرتے تھے کہ ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے پاس اتنی دولت ہے جتنا جھوٹ بھی نہیں بولا جا سکتا، لیکن اپنے پیارے اور غریب وطن میں یہ کوٹھیاں دیکھ کر پتہ چلا کہ پاکستان میں راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کی کوئی کمی نہیں۔ ظہیر کا باپ ایسا ہی نواب تھا۔

ان کوٹھیوں میں رہنے والے ایک دوسرے سے واقف اور آشنا نہیں تھے کیونکہ کوئی کہیں سے آکر یہاں آباد ہُوا اور کوئی کہیں اور سے آیا اور یہاں کوٹھی بنالی۔ یہ آبادی بہت ہی دُور دُور تک پھیل گئی۔ دولت کی نمائش ایسے ایسے طریقوں سے ہونے لگی کہ وہاں جا کر صرف یہ پتہ چلتا تھا کہ یہ لوگ پاکستانی ہیں لیکن یہ پاکستان کا علاقہ نہیں۔ یہاں کے طور طریقے کچھ اور ہی تھے۔

ظہیر کا خاندان اسی دُنیا کا رہنے والا تھا۔ ظہیر کے باپ نے اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر بتایا کہ لڑکا اپنے آپ میں گم رہتا ہے۔ اکیلا بیٹھا کبھی مسکراتا ہے اور کبھی بہت ہی اُداس ہوتا ہے اور کبھی اس کے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ اس کی نیند اور بھوک کم ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر نے تشخیص کے لئے کچھ باتیں پوچھیں۔ پتہ چلا کہ ظہیر اس حالت تک آٹھ نو مہینوں میں پہنچا ہے۔ وہ تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ نوجوانوں کی طرح ہنستا کھیلتا، ناچتا کودتا اور شرارتیں بھی کرتا تھا۔ اس میں یہ تبدیلی آئی کہ کھیل کود سے منہ موڑنے لگا۔ ماں باپ نے پہلے پہل توجہ نہ دی لیکن ایک روز باپ نے اُسے اکیلا بیٹھے مسکراتے دیکھا۔ ظہیر کو پتہ نہ چلا کہ اُس کا باپ اُسے دیکھ رہا ہے۔ ظہیر مسکراتا رہا پھر اس طرح اُداس ہو گیا جیسے اُسے کوئی افسوسناک بات یاد آگئی ہو۔

باپ عقل اور ہوش والا آدمی تھا۔ اُسے فکر پیدا ہُوا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ظہیر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ظہیر اس طرح اُچھل پڑا جیسے اُسے باپ نے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ باپ نے اُس سے مسکرانے کی اور

پھر اُداس ہو جانے کی وجہ پوچھی تو ظہیر نے کہا کہ وہ نہ مُسکرایا ہے نہ اُداس ہُوا ہے۔ وہ ہنس پڑا لیکن باپ کو شک ہو گیا کہ لڑکے کا ذہن بھٹکتا ہے۔ اس کے بعد باپ نے اُسے چھُپ چھُپ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ظہیر کو اُس نے تین چار مرتبہ اسی حالت میں دیکھا اور ایک بار اُس نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ پھر باپ نے یہ بھی دیکھا کہ ظہیر ریڈیو سے فلمی گانے سُنتا ہے اور جب گانا درد ناک ہوتا ہے تو اُس کی آہیں نکلتی ہیں اور پھر آنسو بہنے لگتے ہیں۔

باپ نے اپنی بیوی اور دو بیٹیوں سے کہا کہ ظہیر ہر نوجوان کی طرح کسی لڑکی کی محبت میں بے حال ہو رہا ہے۔ اس سے پوچھو کہ وہ کون ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہوئی اُس کے ساتھ ظہیر کی شادی کر دی جائے گی۔ ماں اور بہنوں نے الگ الگ اُس سے پوچھا۔ اُس نے کہا کہ وہ کسی کی محبت میں بے حال نہیں ہو رہا۔ آخر باپ نے اُسے کہا کہ وہ کسی بھی لڑکی کی طرف اشارہ کرے اس کی شادی اُس کے ساتھ کرا دی جائے گی۔ باپ کو اپنی دولت، بے اندازہ زمین اور اتنی بڑی کوٹھی پر ناز تھا۔ وہ کسی کی بھی بیٹی کو خرید لینے کی طاقت رکھتا تھا، مگر ظہیر نے کہا کہ اُس کے دل میں کوئی لڑکی نہیں۔

باپ نے اُس کے دوستوں سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ ظہیر نے اُن کے ساتھ کبھی کسی لڑکی کا ذکر نہیں کیا۔ باپ نے ظہیر کو کار لے دی۔ ظہیر خوش تو بہت ہُوا لیکن اُس کی وہ کیفیت بگڑتی گئی جس میں اُسے اُس کے باپ نے دیکھا تھا۔ اُسے پڑھنے میں دلچسپی نہ رہی۔ ڈیڑھ دو مہینوں بعد وہ بالکل ہی گم صُم رہنے لگا۔ وہ کالج جاتا تھا۔ شام کو کار میں گھومنے پھرنے جاتا تھا۔ گھر والوں کے ساتھ اس کا سلوک اچھا تھا لیکن وہ باتیں کرتے کرتے اپنے آپ میں گم ہو جاتا تھا۔

اُس کی بھوک اور نیند کم ہوئی تو وہ چہرے سے مریض نظر آنے لگا۔

ظہیر کا خاندان بہت امیر تھا۔ اتنے بڑے شہر میں کوٹھی تھی، کار تھی لیکن وہ سب دیہات میں جنے پلے تھے اس لئے ان میں دیہاتی پسماندگی بھی موجود تھی۔

ظہیر کی ماں اُسے گاؤں لے گئی اور کسی پیر کو دکھایا۔ پیر نے کہا کہ لڑکا خوبصورت ہے اس وجہ سے اس پر ایک جِن عاشق ہو گیا ہے۔ پیر نے تعویذ وغیرہ دیتے۔ پیر کے لئے یہ اسامی مالدار تھی۔ اُس نے خوب پیسے بٹورے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور آدمی نے جس کے تعلقات جِنّوں کے ساتھ تھے، بتایا کہ لڑکے پر ایک چڑیل کا اثر ہے۔ اگر اس چڑیل سے پیچھا نہ چھڑایا گیا تو وہ لڑکے کو غائب کر دے گی۔

"لڑکا گاؤں سے بھاگتا تھا"— ظہیر کے باپ نے ڈاکٹر کو بتایا— "پیروں وغیرہ کو گالیاں دیتا تھا۔ آخر وہاں سے ماں کو بتائے بغیر بھاگ آیا۔"

پھر کسی نے انہیں ایک حکیم کا پتہ دیا۔ اُس نے جگر کی خرابی بتائی۔ ہفتہ دس دن اس کا علاج ہُوا لیکن لڑکے کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ بیماری کی علامت یہی تھی کہ ایک جگہ ٹکٹکی باندھ لیتا اور گم ہو جاتا تھا۔ کبھی مُسکراتا، کبھی اُداس ہو جاتا اور کبھی آنسو نکل آتے۔ اب وہ زیادہ وقت اسی کیفیت میں رہتا تھا۔

آخر میں اُسے اس ڈاکٹر کے پاس لایا گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے الگ بٹھا کر پہلے تو اُس کا جسمانی معائنہ کیا، پھر اُس کی ذاتی سرگرمیوں، پسند اور ناپسند کے متعلق پُوچھا۔ یہ بھی سراغ لگانے کی کوشش کی کہ ظہیر نوجوانوں کی طرح جنسی خیالات سے دل بہلاتا ہو گا۔ یہ نوجوانوں کا عام مرض ہے۔ وہ پُرلطف تصوّروں میں کھوتے رہتے ہیں۔ ظہیر نے انکار کیا۔ ڈاکٹر نے اُسے ڈرایا کہ وہ اگر تھوڑا ہی عرصہ اور اس کیفیت میں رہا تو وہ پاگل ہو جائے گا اور اُسے پاگل خانے میں داخل کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر نے اُسے بتایا کہ پاگل خانے کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نفسیات کی بھی کچھ مہارت رکھتا تھا۔ اس نے ظہیر کے منہ سے وہ راز نکلوا لیا جو اُس نے اپنے دوستوں کو بھی نہیں بتایا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک ایسی عورت کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں جو عمر میں اُس

سے کچھ سال بڑی ہے۔ تعلقات بالکل پاک تھے لیکن محبت اتنی شدید کہ لڑکا اسی عورت کے خیال میں گم رہتا تھا۔

"میں اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ نہیں مانتی۔"

ظہیر نے کہا— "وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا میں اُسے چاہتا ہوں۔"

"کیا وہ شادی شُدہ ہے؟"

"وہ نہیں بتاتی"— ظہیر نے کہا— "میں اُسے جہاں بلاتا ہوں وہ آجاتی ہے۔ مجھے ملنے کے لئے وہ بےتاب رہتی ہے۔ کہتی ہے شادی نہیں کروں گی۔ جہاں کہو گے، جب کہو گے آجایا کروں گی .... میں اپنے ماں باپ کو نہیں بتاتا کیوں کہ وہ پسند نہیں کریں گے کہ اپنی عمر سے زیادہ عمر کی عورت کے ساتھ شادی کروں۔ میں جب اُسے ملنے کے لئے جا رہا ہوتا ہوں اور جب اُس کے پاس ہوتا ہوں تو میں بالکل نارمل ہو جاتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ مجھ جیسا خوش قسمت کوئی نہیں اور یہ مجھے ساری دُنیا کے خزانے مل گئے ہیں۔ میں جب اُس سے دُور ہوتا ہوں تو وہ مجھے اپنے سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تصوّر ہے لیکن کبھی کبھی مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تصوّر نہیں۔ میں شاید یہ سمجھ کر کہ یہ تصوّر نہیں مسکراتا ہوں۔ جب خیال آتا ہے کہ یہ تصوّر ہے تو میری آہیں اپنے آپ نکل جاتی ہیں۔ میں اُسی کے تصوّر میں گم رہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس اثر کو کیا کہوں۔ آپ اسے جادو کہیں یا کچھ اور کہہ لیں، میں اُس کے قبضے میں ہوں۔"

اُس نے اس عورت کا نام پتہ بتانے سے انکار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے باپ کو بھی نہیں بتائے گا کیونکہ وہ اُسے یہ سمجھ کر اس عورت سے ملنے سے روک دے گا کہ یہ کوئی فاحشہ عورت ہے۔

ڈاکٹر نے اُسے ذہنی سکون کے لئے گولیاں دے دیں۔ ڈاکٹر کو شک تھا کہ یہ کوئی حقیقی عورت نہیں بلکہ لڑکے کا تصوّر ہے جسے وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق یہ SCHIZOPHRENIA کا مرض تھا۔ یہ ایک ذہنی کیفیت ہوتی ہے جس میں مریض تصوّرات میں

ایسا ممکن ہوتا ہے کہ انہیں وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ وہ حقیقی دُنیا سے قطع تعلق کر کے اپنی دُنیا میں گم رہتا ہے۔ یہ خطرناک کیفیت ہوتی ہے جس سے مریض کو نجات دلانا خاصا مشکل کام ہے۔

ڈاکٹر نے ظہیر کو باہر بھیج کر اس کے باپ کو اندر بلایا اور اسے بتایا کہ یہ پیروں اور اُن کے تعویذوں کا کیس نہیں نہ کوئی حکیم اس کا علاج کر سکتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ ڈاکٹر نے ظہیر کے باپ کو بتایا کہ وہ اس کا علاج کرے گا اور کچھ دنوں بعد ہی بتا سکے گا کہ اس کی تشخیص صحیح ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر نے باپ کو بتایا کہ اُسے ظہیر کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ باتیں کیسی کی جائیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے باپ کو بتا دیا کہ ظہیر کہتا ہے کہ اُسے ایک عورت کے ساتھ محبت ہو گئی ہے۔

"میں اسے تصوّر سمجھ رہا ہوں" ڈاکٹر نے کہا — "لیکن کسی طرح معلوم کریں کہ یہ واقعی کسی عورت سے ملتا ہے؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسی عورت کا وجود ہے یا نہیں"

تیسرے چوتھے روز ظہیر کا باپ ڈاکٹر کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ اُس نے اُس عورت کو دیکھ لیا ہے۔ وہ تصوّر نہیں۔ وہ حقیقی عورت ہے اور وہ بہت ہی خوبصورت عورت ہے۔

"میں نے ظہیر کے ایک دوست سے کہا تھا کہ وہ ظہیر کا پیچھا کر کے دیکھے کہ وہ کہاں جاتا ہے اور کیسے ملتا ہے" ظہیر کے باپ نے کہا —— "اُس لڑکے نے دوسرے ہی دن مجھے بتایا کہ ظہیر ایک نرس سے ملنے جاتا ہے۔ وہ شاید سٹاف نرس ہے۔ ان کی ملاقات ایک باغ میں ہوتی تھی۔ دوسرے دن ظہیر کے اس دوست کی راہنمائی میں میں بھی اُس کے ساتھ اس عورت کو دیکھنے چلا گیا۔ ہم دونوں چُھپ چُھپ کر ظہیر کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس کی کار ہسپتال کے بڑے گیٹ پر رُک گئی۔ وہ عورت شاید وہیں کہیں انتظار کر رہی تھی۔ وہ بڑی تیز تیز آئی۔ ظہیر نے کار سے

نکل کر اُس کے لئے دروازہ کھولا۔ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ظہیر نے سٹیئرنگ پر بیٹھ کر کار موڑی اور کار نظروں سے اوجھل ہو گئی"

ظہیر کا باپ بہت پریشان تھا۔ اُس کی زبان بولتے بولتے رُک جاتی تھی۔ اُس نے ایک کہانی سنادی جو بہت سے قارئین کے لئے عجیب وغریب بلکہ بعض کے لئے ناقابلِ یقین ہو گی۔

"ڈاکٹر صاحب! اکیس بائیس برس گزرے میں نے شادی کی تھی" — ظہیر کے باپ نے کہا — "ہماری زمین ادھر بھی تھی اور انڈیا میں بھی۔ ہم اُس وقت انڈیا میں تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم دیہات کے لوگ کتنے ہی شہنشاہ کیوں نہ ہو جائیں ہماری شادیاں برادریوں کی پابندیوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ جوڑے برادریوں کے اصولوں کے مطابق بنتے ہیں خواہ لڑکی لڑکا ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہوں۔ میرے لئے بھی ایسی ہی ایک لڑکی ریزرو تھی جو مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔ میں نے اپنے لئے شہر کی ایک لڑکی پسند کر لی۔ اُس وقت اُس نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ اُس کے بڑے بھائی کے ساتھ میرا دوستانہ تھا۔ میری اور اُس لڑکی کی آپس میں کچھ ایسی پسندیدگی پیدا ہوتی جسے آپ محبت کہہ لیں، کچھ کہہ لیں۔ اُس کی شکل وصورت ایسی تھی کہ سولہ سال کی عمر میں وہ بارہ تیرہ سال کی بچی لگتی تھی۔ صرف قدبُت سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کی عمر کچھ زیادہ ہے....

"میں نے اُس کے بھائی سے بات کی۔ خود لڑکی ہمت اور حوصلے والی اور اپنی بات منوانے والی تھی۔ اُس نے اپنے باپ اور بڑے بھائی کو مجبور کر دیا کہ اُس کی شادی میرے ساتھ کی جائے۔ میں نے جب اپنے ماں باپ سے بات کی تو انہوں نے باہر کی لڑکی کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں سرکش آدمی تھا۔ اُس وقت میری عمر بائیس سال ہو گئی تھی۔ امیر کبیر زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیٹے عموماً سرکش ہوا کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو خودکشی کی یا گھر سے ہمیشہ کے لئے چلے جانے کی دھمکی دی تو انہوں نے بادلِ نخواستہ مجھے شادی کی اجازت دے دی لیکن

جو لڑکی میرے لئے ریزرو رکھی گئی تھی، اُس کا خاندان میرا دشمن ہوگیا۔ برادری نے بھی میرے اس فیصلے کو پسند نہ کیا ....

"میں نے اس شہری لڑکی سے جو ابھی کمسن تھی شادی کرلی۔ ہم صرف دس بارہ دن ہنسی خوشی رہ سکے۔ اس کے بعد مجھے شکایتیں ملنے لگیں کہ میری بیوی میری ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی اور اُسے دیہاتن اور پسماندہ کہتی ہے۔ میں نے بیوی سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ اپنی ماں کو میرے سامنے بٹھاؤ اور درمیان میں قرآن رکھ دو ..... ڈاکٹر صاحب! آپ نے دیہات بلکہ شہروں میں بھی نہیں دیکھا کہ گھریلو سیاست میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات نہیں کی جاتی نہ یہ کوشش کی جاتی ہے کہ مل بیٹھ کر غلط فہمی رفع کرلی جاتے۔ عورتیں تو یہی چاہتی ہیں کہ ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم جاری رہے خواہ الزام جھوٹے اور بے بنیاد ہی ایک دوسرے پر تھوپے جائیں ....

"میں ناتجربہ کار تھا۔ میری بیوی کم عمر تھی۔ بدقسمتی سے میں نے کچھ تعلیم حاصل کرلی تھی۔ اگر میں ان پڑھ ہوتا تو اس سیاست میں پُورا اُترتا۔ میں اور نجمہ (بیوی) یہ سمجھ کر برداشت کرتے رہے کہ یہ دیہاتی لوگ کچھ نہیں سمجھ سکتے لیکن کچھ عرصے بعد نجمہ کے خلاف یہ شکایت ملنے لگی کہ گاؤں کے خوبرُو آدمیوں کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتی ہے۔ یہ کہہ لیں کہ نجمہ کے چال چلن پر شک ہونے لگا۔ میں آپ کو تفصیلات نہیں بتا سکتا کہ کیسے کیسے طریقوں سے اور کیسی کیسی باتوں سے میرے دل میں نجمہ کے خلاف شکوک پیدا کئے گئے ....

"اُدھر نجمہ کی ماں تھی۔ اُس کے متعلق تو میں یہی کہوں گا کہ لالچی عورت تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے ذریعے مجھے کھا رہی تھی۔ میرے گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ میں اس عورت کی ہر ایک فرمائش پوری کرتا تھا۔ نجمہ کو میں پیسے دیتا رہتا تھا۔ وہ جب بھی اپنی ماں کے پاس جاتی سارے پیسے اپنی ماں کو دے آتی۔ نجمہ کی ماں مجھے اپنے پاس بٹھاتی تو میری ماں، میری بہنوں اور میرے باپ کے خلاف باتیں کرتی۔ مجھے بدظن کرتی، پھر اُس نے یہ کہنا

شروع کردیا کہ میں شہر میں کوٹھی بنواؤں اور یہیں رہوں۔ مختصر یہ کہ اُس نے نجمہ کو اپنے اثر میں رکھا ہُوا تھا۔ ایسی لڑکیاں اپنے خاوندوں کے ساتھ کبھی آباد نہیں ہوسکتیں جو اپنی لالچی ماؤں کے اثر میں رہتی ہیں۔ میری ساس بڑی ہی گھٹیا عورت ثابت ہوئی۔ اُس میں ایک خرابی یہ تھی کہ دوسروں پر جھوٹے الزام عائد کرتی اور اپنے فائدے کے لئے جھوٹ بولتی تھی ....

"نجمہ نے بھی یہی رویہ اختیار کرلیا۔ وہ اپنی ماں کے اثر سے نکلتی نہیں تھی۔ ہر بات اپنی ماں کی مرضی کے مطابق کرتی تھی۔ اُس نے کتنی بار میرے کہنے پر عمل نہ کیا اور وہ کیا جو اُسے ماں نے کہا تھا۔ گاؤں میں الگ محاذ قائم ہوچکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میرے اور نجمہ کے درمیان چپقلش پیدا ہوگئی۔ اُس نے مجھ پر حکم چلانے شروع کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میں اپنی ماں، بہنوں اور دیگر رشتہ داروں کو سچّا سمجھنے لگا ....

"شادی کے دسویں مہینے ہمارا پہلا بچّہ پیدا ہُوا۔ یہ بچّہ ظہیر تھا۔ اس بچّے کی پیدائش پر ایک لڑائی لڑی گئی۔ میری ماں کہتی تھی کہ پہلا بچّہ اپنے ننھیال میں پیدا ہوتا ہے، یعنی نجمہ کو بچّہ پیدا کرنے کے لئے اپنے میکے جانا چاہیئے۔ نجمہ کی ماں خرچ کرنے والی نہیں تھی، وہ تو کھانے والی عورت تھی۔ میں نے جھگڑا ختم کرنے کے لئے اُسے درپردہ کہا کہ خرچ میں دے دوں گا، تم نجمہ کو گھر لے آؤ۔ وہ مان گئی لیکن نجمہ نے میری پیشکش کو اپنی توہین سمجھا۔ اُس وقت تک نجمہ مجھ سے کھچی کھچی رہنے لگی تھی۔ مجھے غصّہ آگیا۔ میں نے کہا کہ تمہاری ماں پہلے روز سے مجھ سے کھا رہی ہے۔ اب تم دونوں میں غیرت جاگ اٹھی ہے ....

"اس پر میری اور نجمہ کی لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد ہم دونوں میں پہلے والی محبّت پیدا ہو ہی نہ سکی۔ اس آگ پر نجمہ کی ماں، میری ماں، میری بہنوں اور قریبی رشتے کی عورتوں نے خوب تیل ڈالا۔ ہماری محبّت اس آگ میں جل گئی۔ پھر ہم ایک دوسرے کے لئے بیگانے ہوگئے۔ میاں بیوی کے تعلقات ختم ہوگئے۔ بچّہ ایک سال کا ہوگیا۔ اُس وقت تک میں اور نجمہ ایک دوسرے کے دشمن ہوچکے تھے۔ نجمہ اپنی ماں کے پاس ایک دو دِنوں کے لئے گئی تو اُس نے واپسی کا نام ہی نہ لیا۔ مجھے کسی نے

بتایا کہ اُس کی ماں اُس کی دوستی کسی اور کے ساتھ کرا رہی ہے اور طلاق تک نوبت پہنچائے گی۔ مجھے ایسی شہادتیں دی گئیں کہ میں مان گیا کہ نجمہ شہر میں کسی اور میں دلچسپی لے رہی ہے ....

"میں نے اپنی ماں، بہنوں اور اپنے باپ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ نجمہ کو گھر لاؤں اور اُسے طلاق دے دوں۔ ان سب نے ایسی ایسی دلیلیں دیں کہ میں اُن کا مرید ہو گیا۔ نجمہ کو لینے گیا تو وہ اُسی وقت میرے ساتھ چل پڑی۔ میں نے راستے میں اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کی ....

"ہم دوپہر کے بعد گھر پہنچے۔ میں نے وقت ضائع نہ کیا۔ نجمہ کو الگ لے جا کر کہا کہ میں اُسے طلاق دے رہا ہوں اور بچّہ میرے پاس رہے گا۔ مجھے توقع یہ تھی کہ وہ فوراً طلاق قبول کر لے گی لیکن وہ مجھ پر برس پڑی۔ میری منّت سماجت کرنے کی بجائے اُس نے چیلنج کے لہجے میں مجھے کہا کہ وہ طلاق قبول نہیں کرے گی اور اسی گھر میں رہے گی۔ وہ دلیر مردوں کی طرح بات کر رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے اُٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔ اس طرح لڑائی جھگڑا ہوا۔ وہ طلاق پر راضی ہو گئی لیکن بچّے کو اپنے ساتھ لے جانے کی ضد کرنے لگی۔ اس مسئلے پر میری اور اُس کی ایسی بحث ہوئی کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور اُسے کہا کہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر اس گھر سے نہ نکلی تو میں اُسے گولی مار دوں گا۔ میں نے کہا — 'یہ شہر نہیں گاؤں ہے۔ یہاں ہمارا قانون چلتا ہے۔ لاش کی بُو بھی تمہارے ماں باپ کو نہیں ملے گی۔ پولیس ہماری ہے، گواہ ہمارے ہیں'....

"گاؤں میں گزارے ہوئے دو سالوں میں وہ دیکھ چکی تھی کہ میں جو کہہ رہا ہوں یہ غلط نہیں اور میں جو دھمکی دے رہا ہوں، اس پر عمل بھی کر سکتا ہوں اور میرے خلاف گواہی دینے والا کوئی نہیں۔ میرا باپ بھی اندر آ چکا تھا۔ نجمہ نے کہا — 'تم نے مجھ سے میرا بچہ چھینا ہے اور مجھے ریوالور دکھایا ہے۔ میرا خُدا سچا ہُوا تو اسی ریوالور کی گولی تیری کھوپڑی سے پار ہو گی' — اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ غصّے سے اُس کا چہرہ لال تھا اور اُس کے دانت

پِس رہے تھے جیسے مجھے کھا جائے گی۔ وہ بچّے کو چھوڑ کر گھر سے نکل گئی۔ میرا باپ اُس کے سامان کے ساتھ اُسے شہر چھوڑ آیا ....

"میں آپ کو یہیں بتا دیتا ہوں کہ تین چار سال بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ نجمہ کے خلاف ہر الزام غلط تھا اور یہ الزام تو بالکل ہی بے بنیاد تھا کہ اُس کی ماں اُس کا دوستانہ کسی اور سے کرا رہی ہے اور وہ طلاق تک نوبت پہنچائے گی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو نجمہ طلاق کے بعد شادی کر لیتی۔ اُس نے شادی نہیں کی۔ پھر مجھے اُس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن نجمہ میرے دل سے اُتر نہ سکی ....

"طلاق کے بعد مجھے تین گھروں سے رشتے پیش ہوئے۔ میں نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ اب میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ میری ہونے والی بیوی خوبصورت ہے یا نہیں۔ میں صرف یہ دیکھوں گا کہ وہ میرے بچّے کی ماں بنتی ہے یا نہیں۔ میں نے ایک قسم کا اعلان کر دیا تھا کہ میرے بچّے کے ساتھ میری بیوی عمر کے کسی بھی حصّے میں سوتیلی ماں جیسا سلوک کرے گی تو میں اُسے طلاق دے دوں گا .... میری ماں اور بہنوں نے ایک لڑکی منتخب کر لی اور اُسے الگ ہو کر کہا کہ اُسے بچّے کی سگّی ماں بننا پڑے گا۔ پھر میری شادی ہو گئی۔ اب میرے ساتھ ہر کوئی خوش تھا ....

"میری بیوی نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اُس نے ظہیر کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ اُس کی ماں کوئی اور تھی۔ ایسی باتیں چھُپی نہیں رہ سکتیں۔ ظہیر کو بارہ تیرہ برس کی عمر میں پتہ چل گیا تھا کہ وہ کسی اور ماں کا بیٹا ہے لیکن اس پر کوئی خطرناک اثر نہ ہُوا۔ وہ میری موجودہ بیوی کی گود میں پلا ہے۔ ایک سال کی عمر میں اس کی گود میں آیا تھا۔ بڑے ہو کر وہ کسی اور ماں کو قبول ہی نہیں کر سکتا تھا۔"

"ذرا ٹھہریئے" — ڈاکٹر نے ظہیر کے باپ کو روک کر کہا — "آپ کہتے ہیں کہ لڑکے کو جب پتہ چلا کہ اس کی ماں کوئی اور تھی تو اس نے کوئی خطرناک اثر نہیں لیا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ اُسی اثر نے اسے اس حال تک پہنچایا ہے۔"

"یہ تو چھ سات سال پُرانی بات ہے جب اسے پتہ چلا تھا۔"

"اس کے اندر ایک احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اس کی ماں کہیں چلی گئی ہے"۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ احساس اس کے اندر گلتا سڑتا رہا اور لڑکا اسے دبانے کی کوشش کرتا رہا مگر یہ احساس اسے تصوروں میں لے جاتا رہا جہاں اسے ماں نظر آتی رہی۔"

"میں اصل بات پر ابھی آیا نہیں"۔ ظہیر کے باپ نے کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں ظہیر کے دوست کے ساتھ ظہیر کے پیچھے گیا۔ اُس نے ہسپتال کے بڑے گیٹ پر کار روکی۔ ایک خوبصورت عورت آئی اور ظہیر کے ساتھ بیٹھ کر چلی گئی .... ڈاکٹر صاحب! وہ نجمہ تھی .... میری پہلی بیوی .... ظہیر کی ماں .... میں نے اُسے اکیس سال بعد دیکھا ہے۔ اس وقت اُس کی عمر ۴۷ سال ہے۔ اگر میں اس کی صحیح عمر نہ جانتا تو میں کہتا کہ یہ چوبیس پچیس برس کی لڑکی ہے۔"

"میرے لئے یا کسی بھی ڈاکٹر کے لئے یہ کوئی عجیب چیز نہیں کہ کوئی انسان اپنی عمر سے بہت کم لگتا ہے یا بہت زیادہ"۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "ڈاکٹر چہرہ دیکھ کر عمر بتا دیا کرتے ہیں لیکن جس چہرے کا ذکر آپ کر رہے ہیں ایسے چہرے ڈاکٹر کو بھی دھوکہ دے دیتے ہیں۔ میں نے پندرہ سولہ برس عمر کے لڑکے دیکھے ہیں جو تیس برس سے اُوپر کے لگتے ہیں۔"

"نجمہ کا چہرہ انہی چہروں جیسا تھا"۔ ظہیر کے باپ نے کہا۔ "میں نے جس وقت نجمہ کو طلاق دی تھی اس سے گیارہ ساڑھے گیارہ سال بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ ہماری بہت زیادہ زمین پہلے ہی اِدھر نہری علاقے میں تھی۔ میرا سارا خاندان اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی اِدھر آ گیا تھا۔ وہاں جو زمین مکان وغیرہ رہ گئے وہ یہاں مِل گئے تھے۔ نجمہ کبھی کبھی یاد آتی تھی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ نجمہ ہندوستان میں ہو گی یا اِدھر آ گئی ہو گی۔ میری دوسری بیوی بڑی اچھی ثابت ہوئی لیکن میں اس لحاظ سے بدنصیب ہوں کہ اس بیوی سے دو بیٹیاں ہی پیدا ہوئیں۔ بیٹا نہ ہُوا۔

بیٹا صرف یہی ہے ....

"میں نے نجمہ کو پہچان لیا۔ نہ جانے کیسے کیسے خیال آتے لیکن یہ اندیشہ مجھے زیادہ پریشان کرنے لگا کہ نجمہ اپنے بیٹے پر قبضہ کر رہی ہے اور اس نے ظہیر کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے اسے اپنی کسی خوبصورت سہیلی یا اپنی کسی رشتہ دار لڑکی کی محبت میں اُلجھا لیا ہے اور ظہیر کی شادی وہ اس کے ساتھ کرے گی۔ مجھے یہ صورت بالکل منظور نہیں تھی۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ نجمہ سے تنہائی میں ملوں گا اور اسے ایک بار پھر ریوالور کی نالی پر دھمکی دوں گا کہ میرے بیٹے سے دستبردار ہو جائے مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ نجمہ رہتی کہاں ہے اور کیا کرتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اُس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے اور اُس نے بازو پر شاید ایپرن ڈال رکھا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ نجمہ ظہیر کو ہسپتال کے گیٹ پر کیوں ملی ہے ظہیر کے دوست نے جو میرے ساتھ تھا مجھے یاد دلایا کہ یہ وہی سٹاف نرس ہو گی۔ یہ شاید ابھی ابھی ڈیوٹی سے فارغ ہوئی ہے ....

"گیٹ پر جو چوکیدار کھڑا تھا، میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ جو نرس گاڑی میں بیٹھ کر گئی ہے اس کا نام نجمہ ہے نا؟ چوکیدار نے کہا اس کا نام نجمہ ہی ہے۔ چوکیدار سے یہ بھی پتہ چلا کہ نجمہ ہسپتال کے اندر ہی کوارٹر میں رہتی ہے۔ میں ظہیر کے دوست کے ساتھ واپس آ گیا۔ میں بہت ہی پریشان تھا۔ ظہیر رات کو گھر آیا تو میں نے اُس سے اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے بہت دُکھ ہو رہا تھا کہ ظہیر مجھ سے چھن رہا ہے۔ ظہیر کے ساتھ میرا جو پیار ہے اسے کوئی باپ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس بیٹے کی خاطر میں نجمہ کو قتل تک کروانے کے لئے تیار ہو گیا ....

"ظہیر نے کھانا نہ کھایا۔ کہتا تھا کہ دوستوں کے ساتھ کھا آیا ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے کھانا کھا کر اپنی بیوی اور ظہیر سے کہا کہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں جا رہا ہوں۔ میں نے کار نکالی اور نجمہ کے ہسپتال جا پہنچا۔ اُس کے کوارٹر تک رسائی ہو گئی۔ میری دستک پر اُس نے دروازہ

کھولا لیکن مجھے دیکھ کر ذرا سی بھی حیران نہ ہوتی۔"

میرے ڈاکٹر صاحب نے جن الفاظ میں اپنے دوست ڈاکٹر سے یہ واقعہ سنا تھا میں انہی الفاظ میں پیش کرتی ہوں۔

"اگر آپ اندر آنا چاہیں تو آسکتے ہیں"۔ نجمہ نے کہا۔ "مجھے شک تھا کہ آپ کسی نہ کسی روز آئیں گے ... میں آپ کو اپنے گھر سے اُس طرح نہیں نکالوں گی جس طرح آپ نے مجھے اپنے گھر سے نکالا تھا۔"

ظہیر کا باپ اندر چلا گیا۔ نجمہ نے اُسے عزت سے بٹھایا۔

"نجمہ!"۔ ظہیر کے باپ نے کہا۔ "مجھ سے میرا بیٹا چھیننے کی کوشش نہ کرو۔ اگر باز نہیں آؤ گی تو تمہارے لئے بہت بُرا ہوگا۔"

"مجھے قتل کرا دیں گے آپ!"۔ نجمہ نے کہا۔ "کیا آج آپ پھر مجھے ریوالور دکھا کر ڈرائیں گے؟"

"میں تمہیں صاف بتا دیتا ہوں کہ ریوالور کے سوا میرے پاس کوئی اور علاج نہیں"۔ ظہیر کے باپ نے کہا۔ "تم اس کی ماں ہو۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ ماں بیٹے کو الگ کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ ماں اپنی جان دے دے گی اپنا بیٹا نہیں دے گی لیکن نجمہ! معلوم نہیں تم جانتی ہو یا نہیں کہ تمہارا بیٹا نیم پاگل ہو چکا ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے اور یہ اپنے آپ میں کھویا رہتا ہے؟"۔ ظہیر کے باپ نے اُسے ظہیر کی ذہنی کیفیت اور جسمانی حالت مکمل طور پر بتائی اور کہا۔ "تم نے اسے یہ بتا کر کہ تم اس کی ماں ہو اس پر ظلم کیا ہے۔"

"میں نے اسے ابھی تک نہیں بتایا کہ میں اس کی ماں ہوں"۔ نجمہ نے کہا۔ "آٹھ نو مہینے گزر گئے ہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر سکی کہ اسے بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ میں نے یہ بھی کئی بار سوچا ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ مل جائے جو مجھے آپ سے اس طرح ملا دے کہ ظہیر کو پتہ نہ چلے اور میں آپ سے پوچھوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔"

ظہیر کے باپ کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ نجمہ کیا کہہ رہی ہے اور اس

کی نیت کیا ہے۔ اُس نے جھنجھلا کر نجمہ سے کہا کہ وہ اسے بتا دے کہ ظہیر اُسے کہاں ملا تھا اور اگر ظہیر کو معلوم نہیں کہ نجمہ اس کی ماں ہے تو وہ ہر روز اس کے پاس کیوں آتا رہا ہے۔

نجمہ نے اُسے بتایا کہ ظہیر کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات اسی ہسپتال میں ہوئی تھی۔ ظہیر کا ایک دوست ہسپتال میں داخل ہوا تھا اور ظہیر اسے دیکھنے آیا تھا۔ مریض پرائیویٹ کمرے میں تھا۔ نجمہ کی نظر ظہیر پر پڑی تو وہ اُسے اتنا پیارا لگا کہ نجمہ ایک گھنٹے میں تین مرتبہ اس کمرے میں آئی۔ ظہیر نے بھی نجمہ کو ایسی نظروں سے دیکھا جنہیں وہ سمجھتی تھی۔ اس عمر تک ان نظروں سے سینکڑوں مردوں نے اُسے دیکھا تھا۔ وہ ان نظروں کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن اب وہ چاہنے لگی کہ ظہیر اُسے انہی نظروں سے دیکھے۔ ظہیر ہر شام اپنے دوست کو دیکھنے کے لئے آنے لگا۔

ایک روز ظہیر برآمدے میں آرہا تھا۔ نجمہ نے مسکرا کر اُسے روک لیا۔ اس سے نام پوچھا اور ذرا سی دیر میں وہ ظہیر کے ساتھ بے تکلف ہو گئی۔ ظہیر کی بھی یہی خواہش تھی۔ ایک شام نجمہ نے ظہیر سے کہا کہ وہ اُس کے کوارٹر میں آئے۔ وہ اُس کے کوارٹر میں چلا گیا۔ اُس روز وہ پیار اور محبت کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی دوسری ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی۔ وہ کیبن میں بیٹھے۔ اُس روز نجمہ نے ظہیر سے اُس کے باپ کے متعلق پوچھا۔ ظہیر نے اپنے باپ کا نام بتایا۔ ظہیر کا یہ نام نجمہ نے ہی رکھا تھا۔ اُس نے جب اپنے باپ کا نام بتایا تو نجمہ چونکی۔ اُس نے پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ ظہیر نے اپنے گاؤں کا نام بتایا جو انڈیا کا ایک گاؤں تھا۔ اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

نجمہ نے اُس سے اُس کی ماں کا نام پوچھا تو ظہیر نے ہنس کر کہا۔ "سنا ہے وہ تمہاری ہم نام تھی۔ میرے ابو کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں اُس وقت ایک سال کا تھا۔ میں سوتیلی ماں کو ہی اپنی سگی ماں سمجھتا ہوں۔ اُس نے مجھے سگی ماؤں کی طرح پالا ہے۔"

"تمہارے ابّو نے تمہیں کیا بتایا ہے کہ تمہاری ماں کیسی تھی؟"

"ابّو نے تو اُسے کبھی بُرا نہیں کہا" — ظہیر نے جواب دیا — "امّی کہتی ہیں کہ نجمہ بہت بُری عورت تھی۔ تمہارے ابّو کو بہت تنگ کرتی تھی۔ امّی اُس کے خلاف باتیں کرتی رہتی تھی۔ اب اُسے بھول گئی ہے۔"

نجمہ کو یقین ہوگیا کہ ظہیر اُس کا اپنا بیٹا ہے۔ اُس نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روکے رکھا اور ظہیر کو سینے سے لگا کر اُس کا منہ، سر اور اُس کے ہاتھ یُوں چُومنے لگی جیسے اُسے چاٹ کر اپنے جسم میں داخل کرلے گی۔ یہ ایک ماں کا والہانہ پن تھا لیکن ظہیر اُسے ماں نہیں بلکہ ایک خوبصورت عورت سمجھتا تھا جو اُس کی محبت میں پاگل ہوتی جارہی تھی۔ نجمہ کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ وہ ظہیر کو بتادے کہ وہ اس کی ماں ہے یا نہیں۔ ظہیر نے جب اُسے بتایا کہ اُس کے باپ نے شہر میں اتنی بڑی کوٹھی بناتی ہے اور اُن کی زمینوں کی آمدنی کا تو کوئی حساب ہی نہیں تو نجمہ نے ہونٹ سی لئے۔ اُس نے سوچا کہ ظہیر کو اگر بتادیا کہ وہ اُس کی ماں ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ظہیر اُس کے پاس آجائے۔ نجمہ کے پاس باعزّت روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا بیٹا شہزادوں جیسی زندگی گزار رہا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ظہیر نجمہ کو کبھی اس کے کوارٹر میں ملتا۔ کبھی کہیں باہر۔ اُس نے آخر نجمہ سے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کرچکا ہے۔ نجمہ نے اسے ہنس کر بتایا کہ وہ اُس سے کم از کم ستّرہ سال بڑی ہے۔ ظہیر بڑی زور سے ہنسا۔ وہ اسے مذاق سمجھا۔ نجمہ نے اُسے منوانے کی بہت کوشش کی کہ وہ اس سے ستّرہ سال بڑی ہے لیکن ظہیر نہ مانا۔ کہتا تھا کہ نجمہ اُس سے زیادہ سے زیادہ چار سال بڑی ہے۔ ظہیر کے باپ نے ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ نجمہ پچیس چھبیس سال کی لگتی ہے۔

"ظہیر مجھے کہتا رہا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گا" — نجمہ نے ظہیر کے باپ سے کہا — "میرے ہونٹوں پہ آگئی کہ میں تمہاری ماں ہوں لیکن بہت کچھ سوچ کر چُپ رہی۔ میں اسے ٹالتی رہی لیکن ماں اپنے بیٹے کو

اپنے سینے سے لگا کر چُومنے سے کس طرح باز رہ سکتی ہے۔ اس پیار کو ظہیر غلط سمجھتا رہا۔ اس نے اتنے پاکیزہ پیار کو ناپاک کرنے کی کوشش شروع کردی۔ میں نے بڑی اُستادی سے اسے اِدھر سے ہٹایا۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ کمزور ہوگیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ پرسوں ترسوں اُس نے بتایا کہ آپ اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ میں نے وہ رات روتے گزاردی تھی۔ آج وہ بھی آیا تھا اور مجھے باہر لے گیا تھا۔ کہتا تھا کہ گھر جاکر وہ میرے تصوّر میں گم ہوجاتا ہے اور ابّو اور امّی کہتے ہیں کہ لڑکے کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے....

"آپ کے آنے سے پہلے میں سوچ رہی تھی کہ آپ سے کس طرح ملوں۔ یہ بھی خیال آیا کہ اس ڈاکٹر سے ملوں جو اس کا علاج کررہا ہے۔ اس سے پوچھوں کہ میں اسے بتاؤں یا نہ بتاؤں کہ میں اس کی محبوبہ نہیں ماں ہوں۔"

"ڈاکٹر سے میں پُوچھ لوں گا" — ظہیر کے باپ نے کہا — "تم نے لڑکے کو تباہ کردیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے حقیقت کا علم ہوجانا چاہیئے۔"

ظہیر کے باپ کو یہ اطمینان ہوگیا کہ ظہیر کسی چالباز عورت کے جال میں نہیں پھنسا۔ وہ نجمہ کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ نجمہ نے اُسے بتایا کہ اُس نے ماں کے مجبور کرنے پر شہر کے ایک آدمی کے ساتھ شادی کرلی تھی لیکن وہ بدکار نکلا۔ شراب بھی پیتا تھا۔ نجمہ نے بڑی مشکل سے اُس سے طلاق لی اور شادی سے توبہ کرلی۔ پھر وہ مذہب میں ڈوب گئی۔ خُدا کی ذات نے اُسے ایسا سکُون دیا کہ اُسے شادی کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی۔ پاکستان میں آکر وہ نرس بن گئی۔

دوسرے ہی دن ظہیر کے باپ نے ڈاکٹر کو بتایا کہ جس عورت کی خاطر لڑکا نیم پاگل ہُوا ہے وہ اس کی ماں ہے۔

"میں نے آپ کو بڑی لمبی کہانی سُنا کر آپ کا بہت سارا وقت ضائع کیا ہے" — ظہیر کے باپ نے ڈاکٹر سے کہا — "اب آپ مشورہ دیں کہ ظہیر

کو بتا دیا جائے کہ نجمہ اس کی ماں ہے؟"

"فوراً بتا دیں" ڈاکٹر نے کہا۔ "اور ظہیر کی شادی کا کہیں انتظام کریں۔"

اگلا دن گزر گیا۔ اس سے اگلے دن اخبار آئے تو ڈاکٹر کی نظر چھوٹی سی ایک خبر پہ پڑی — "ایک نوجوان نے خودکشی کر لی"۔ خبر میں خودکشی کرنے والے کا نام ظہیر لکھا تھا۔ ساتھ باپ کا نام بھی تھا۔ خودکشی کی وجہ نہیں لکھی تھی۔ ظہیر نے باپ کے ریوالور سے اپنی کنپٹی میں گولی مار لی تھی۔

ڈاکٹر ظہیر کے گھر چلا گیا۔ باپ ڈاکٹر کے گلے لگ کر رو دیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے ظہیر کو بتایا کہ نجمہ اس کی ماں ہے تو وہ جیسے سُن ہو گیا ہو۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ دوسرے دن وہ اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ معلوم نہیں کس وقت اُس نے ریوالور نکال لیا۔ شام سے ذرا پہلے اُس کے کمرے سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر جا کے دیکھا۔ ریوالور اُس کے قریب پڑا ہوا تھا۔ اُس نے کنپٹی پہ نالی رکھ کر گولی چلائی تھی۔ وہ فوراً مر گیا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ لڑکا MOTHER FIXATION کا شکار ہوا ہے اور اُس نے اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے خودکشی کی ہے۔ اسے مرحوم نے ناقابلِ معافی گناہ سمجھا تھا کہ وہ اپنی ماں کو محبوبہ سمجھتا رہا۔

"نجمہ کو میں نے جب طلاق دی تھی تو ریوالور نکال کر اُسے دھمکی دی اور کہا تھا کہ میں اُسے گولی مار دوں گا" ظہیر کے باپ نے ڈاکٹر سے کہا۔ "اور نجمہ نے کہا تھا کہ تم نے مجھ سے میرا بچہ چھینا ہے اور مجھے ریوالور دکھایا ہے۔ میرا خُدا سچا ہُوا تو اِسی ریوالور کی گولی تیری کھوپڑی سے پار ہو گی .... ڈاکٹر صاحب! نجمہ کا خُدا سچا تھا۔ بیٹے کے مرنے کے بعد میں کیسے زندہ رہوں گا؟"

ظہیر کے باپ کے کہنے پر ظہیر کے ایک دوست نے نجمہ کو اطلاع دے دی تھی۔ نجمہ نے آ کر اپنے بیٹے کی میّت دیکھی۔ بہت دنوں بعد ظہیر کے باپ نے ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ اپنے بیٹے کی میّت پر نجمہ کو دیکھا۔ اب وہ پچاس برس کی بڑھیا لگتی تھی۔

نجمہ کے بھی انجام کا پتہ چلا۔ بیٹے کے غم نے اسے ایسی بیماری میں مبتلا کر دیا کہ بیس بائیس روز بعد وہ اسی ہسپتال کے ایک کمرے میں مر گئی۔

روگی بہن

ڈاکٹر علوی صاحب مرحوم میرے والد مرحوم کے گہرے دوست تھے۔ اِدھر میرے والد صاحب فوت ہوتے اُدھر کراچی میں بمشکل تین ماہ بعد ڈاکٹر علوی بھی فوت ہو گئے۔ میں ایم۔ اے سائیکالوجی کی تیاری کر رہی تھی۔ ڈاکٹر علوی مجھے کوئی نہ کوئی نکتہ سمجھانے کے لئے کوئی کیس سُنا دیا کرتے تھے۔ میں اُس وقت حیران ہُوا کرتی تھی کہ انسانی فطرت میں کیسے کیسے عجوبے پوشیدہ ہیں۔ اب جب کہ میں علمِ نفسیات کی ڈگری لے چکی ہُوں اور انسانی فطرت کے پوشیدہ گوشے بھی میں نے دیکھ لئے ہیں میں پھر بھی حیران ہوتی ہوں کہ انسان جب اچھائی پر اُتر آتے تو اُس کی کوئی حد نہیں اور وہ بُرائی کرنے لگے تو اس کی بھی کوئی حد نہیں۔

ڈاکٹر علوی نے عورت کی نفسیات کا ایک نکتہ واضح کرنے کے لئے مجھے ایک جوان عورت کا کیس سُنایا۔ یہ کیس ڈاکٹر علوی کے کسی دوست ڈاکٹر کا تھا۔ کیس یہ تھا کہ تیس بتیس سال عمر کی ایک عورت ڈاکٹر کے پاس یہ شکایت لے کر گئی کہ چوبیس گھنٹے میں کم از کم ایک مرتبہ اُس کے پیٹ میں ایک گولا سا بن جاتا ہے اور یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے تمام انتڑیاں گچھا بن کر ایک مقام پر اکٹھی ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس عورت کا (جسے آپ نہ بیدہ کہہ لیں) دماغ ماؤف سا ہو جاتا تھا۔ اس مرض نے اس کے چہرے کا رنگ پیلا کر رکھا تھا۔

ڈاکٹر نے اُس سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھا اور اُس کا جو معائنہ ضروری

تھا اُس نے کیا اور جو دوائیاں دینی تھیں وہ اُس نے اُسے دے دیں لیکن مریضہ کو ذرا سا بھی افاقہ نہ ہُوا۔ ڈاکٹر نے دوائیاں تبدیل کیں اور ایک دو پیٹینٹ دوائیاں بھی لکھ دیں۔ پھر بھی مریضہ کے دَوروں میں کوئی فرق نہ آیا۔

اُن دِنوں لوگوں کی عام صحت بڑی اچھی ہُوا کرتی تھی۔ ملاوٹ شروع ہو چکی تھی پھر بھی خالص دُودھ اور قدرتی کھاد کی پیدا کی ہوئی گندم اور کہیں نہ کہیں سے خالص گھی مِل جاتا تھا، اس لئے ڈاکٹروں کے پاس مریضوں کا آج کی طرح ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں کو اتنا وقت مِل جاتا تھا کہ وہ ہر مریض کو پوری توجہ سے دیکھ سکتے تھے۔

ڈاکٹر نے دیکھا کہ زبیدہ کو ایک مہینے تک ذرا سا بھی افاقہ نہیں ہُوا تو ڈاکٹر نے اُس کی نفسیات کی طرف توجہ دی۔ یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ اس مرض کا تعلق کسی نفسیاتی اُلجھن کے ساتھ ہے، ڈاکٹر نے اُسے ذہنی سکون کے لئے ویلیَم کی گولیاں دے دیں اور کہا کہ یہ صرف تین دن استعمال کرے۔

چوتھے دن زبیدہ نے آکر بتایا کہ تین دن وہ بالکل ٹھیک رہی ہے۔ اُس کا پیٹ بالکل صحیح رہا ہے۔ اتنا اثر ضرور ہُوا ہے کہ ہر وقت غنودگی سی طاری رہتی ہے۔

"ڈاکٹر صاحب!" ــــ زبیدہ نے کہا ــــ "مجھے یہی دوائی دیں۔"

"نہیں" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "یہ کوئی علاج نہیں۔ میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، وہ معلوم کر لیا ہے۔ تمہارے ذہن پر کوئی ایسا بوجھ ہے جسے تم سمجھتی نہیں یا پھر بتانا ضروری نہیں سمجھتیں۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری ازدواجی زندگی کیسی گُزر رہی ہے؟"

"ازدواجی زندگی؟" ــــ زبیدہ نے مُسکرا کر کہا ــــ "میں نے تو ابھی تک شادی ہی نہیں کی۔"

ڈاکٹر نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ اُس نے شادی کیوں نہیں کی؟ ڈاکٹر کو یہ اطمینان بھی ہُوا کہ اُس نے مریضہ کا مرض سمجھ لیا ہے۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ پیٹ میں وہ جو گولا سا محسوس کرتی ہے یہ ہسٹریا

کی ایک قسم ہے جس کا تعلق جنسی جذبات سے ہے۔ کہتے ہیں کہ شادی مذہبی فریضہ ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن شادی اور بچّے پیدا کرنا ایک ایسی نفسیاتی ضرورت ہے جو عمر کے ایک خاص حصّے تک پوری نہ ہو تو مرد ہو یا عورت اُس کا کسی نہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو جانا لازمی ہوتا ہے۔

زبیدہ نے ڈاکٹر کو شادی نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ اُس کی ماں مر چکی ہے۔ باپ کسی جسمانی معذوری کی وجہ سے کام دھندہ کرنے کے قابل نہیں.... زبیدہ سے چھوٹے اُس کے دو بھائی تھے۔ باپ اور بھائیوں کی دیکھ بھال اور گھر کا کام کاج زبیدہ کے ذمّے تھا۔ اب زبیدہ کسی پرائیویٹ سکول میں اُستانی تھی۔ اِس کے علاوہ اُس نے کچھ بچوّں کی ٹیوشنیں رکھی ہوئی تھیں۔ بچّے بچیاں اُس کے گھر آجاتے، وہ انہیں پڑھاتی اور ہانڈی روٹی بھی کرتی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اُس کا چھوٹا بھائی نویں جماعت میں اور بڑا کالج میں پڑھتا تھا لیکن بڑا ہر سال فیل ہوتا اور دن بدن آوارہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ باہر سے اُس کی شکائتیں آتی رہتی تھیں۔ زبیدہ نے اُسے رو رو کر سمجھایا کہ وہ اپنی ذمّہ داری کو سمجھے اور دیکھے کہ اُس کی بہن کما رہی ہے اور مردوں کو کِھلا رہی ہے۔ بڑا بھائی جسے آپ ناصر کہہ لیں ذرا سا بھی اثر قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ آوارگی بلکہ بدمعاشی کی اُس حد تک جا پہنچا تھا کہ کبھی کبھی زبیدہ سے لڑ جھگڑ کر پیسے لے جاتا تھا۔ اس طرح زبیدہ اور ناصر میں نفرت سی پیدا ہو گئی تھی۔

"زبیدہ بیٹی!" ــــ ڈاکٹر نے کہا ــــ "جو کچھ بھی ہے تمہیں شادی کر لینی چاہیئے ورنہ تمہارا یہ مرض خطرناک قسم کا ہسٹریا بن جائے گا۔ پھر کہا نہیں جا سکتا کہ تمہیں کہاں دَورہ پڑ جائے۔ دورہ کلاس روم میں بھی پڑ سکتا ہے۔ بس میں بھی پڑ سکتا ہے اور ایسی جگہ بھی دَورہ پڑ سکتا ہے جہاں تمہیں سنبھالنے کی بجائے کوئی چور بدمعاش اُٹھا کر ہی لے جائیں گے اور غائب کر دیں گے۔" ــــ ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا ــــ "تم اچھی خاصی شکل کی لڑکی ہو۔ کیا تمہیں کوئی ایسا آدمی نہیں مِل سکتا جو تنہا ہو اور وہ تمہارے گھر میں ہی آکر رہے؟.... کیا اس عمر تک تم نے اپنا کوئی ساتھی پسند نہیں کیا؟ ڈاکٹر کو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسم کے ذاتی سوال پوچھنے پڑتے ہیں۔ میری تشخیص یہ ہے کہ تمہارا یہ جسمانی
مرض دراصل نفسیاتی ہے۔ تم اپنے ایک فطری عمل کو زبردستی روکنے کی
کوشش کر رہی ہو۔"

"ہاں ڈاکٹر صاحب!"۔۔۔ زبیدہ نے کہا۔۔۔ "میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔
میں نے اپنی زندگی کا ساتھی نہ صرف پسند کر لیا ہے بلکہ مجھے اُس کے ساتھ اور
اُسے میرے ساتھ اتنی محبت ہے کہ ملے ہوتے اگر دو دن گزر جائیں تو ہم
دونوں بے چین ہو جاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں مل بیٹھتے ہیں جس سے دل کو
بہت سکون ملتا ہے۔"

"میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس کے ساتھ تمہارے تعلقات
پاکیزہ ہیں"۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "ورنہ تمہیں یہ مرض لاحق نہ ہوتا۔"

"بالکل پاکیزہ"۔۔۔ زبیدہ نے کہا۔۔۔ "ہم نے شادی کا فیصلہ کر رکھا ہے
لیکن رکاوٹ صرف یہ ہے کہ میں اُسے کہتی ہوں کہ وہ میرے گھر میں رہے۔
وہ میری مجبوریوں کو سمجھتا ہے لیکن اُس کی مجبوری یہ ہے کہ ماں باپ اُسے
میرے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

ڈاکٹر نے اُسے کہا کہ وہ اُسے کسی بھی دوائی سے ٹھیک نہیں کر
سکتا اور ایسا تو وہ کبھی بھی نہیں کرے گا کہ اُسے ذہنی سکون کی گولیاں دیتا
چلا جاتے۔ ڈاکٹر نے اُسے خبردار کیا کہ وہ اپنے طور پر کہیں یہ گولیاں کھانا
شروع نہ کر دے، ورنہ وہ جذباتی طور پر مُردہ ہو جائے گی اور ایک وقت
آئے گا کہ جس کے ساتھ اُسے رومانی لگاؤ ہے اُس کے لئے وہ جذباتی طور
پر بالکل سرد ہو جائے گی۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ محبت ختم ہو جائے گی۔

ڈاکٹر نے اُسے یہی ایک علاج بتایا کہ وہ شادی کر لے۔

یہ ڈاکٹر کی دیانتداری اور خلوص تھا کہ اُس نے زبیدہ کو کوئی دوائی نہ دی۔
وہ کچھ مایوس ہو کر چلی گئی۔ تین چار روز بعد وہ پھر ڈاکٹر کے پاس آئی۔ اب وہ پھر
دیکھنے میں مریضہ لگتی تھی۔ اُس کے چہرے پر مرض کے علاوہ اُداسی کے آثار
بھی تھے۔ اُس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اب دَورے پہلے سے زیادہ شدید ہو گئے

ہیں۔ ڈاکٹر نے اُسے ایک بار پھر وہی لیکچر دیا جو وہ تین چار روز پہلے دے
چکا تھا۔

"زبیدہ بیٹی!"۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں اپنی تشخیص بتا چکا ہوں۔
اب پھر بتا دیتا ہوں۔ اپنا علاج خود کر لو۔ میں تمہارے پیسے ضائع نہیں کرنا
چاہتا۔ تمہارا سارا مرض ذہنی ہے۔ ایک یہ کہ تم نے شادی نہیں کی۔ نمبر دو یہ
کہ جو تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور جسے تم دل وجان سے چاہتی
ہو وہ تمہاری شرط قبول نہیں کر سکتا۔ تیسرے یہ کہ تمہارا معذور باپ تمہارے
جذبات پر اثر انداز ہو رہا ہے پھر تمہیں نوکری کرنی پڑتی ہے۔ تم ٹیوشنیں
پڑھاتی ہو اور گھر کا کام کاج بھی کرتی ہو۔ تم مشین تو نہیں۔ ان حالات کا جائزہ
خود لے لو اور دیکھو کہ تم ان کے اثرات سے کس طرح بچ سکتی ہو۔"

"ایک وجہ اور بھی ہے ڈاکٹر صاحب!"۔۔۔ زبیدہ نے کہا۔۔۔ "آپ نے
ادھر توجہ نہیں دی۔ یہ میرا بھائی ہے جس نے مجھے اس مرض کا نہیں بلکہ
ایسے لگتا ہے جیسے دِق کا مریض بنا دیا ہے۔"

"وہ بدمعاشیاں کرتا ہے نا!"۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "اگر تمہارا باپ اس
لڑکے پر قابو نہیں پا سکتا تو محلّے کے دو چار بزرگوں کو بتاؤ تا کہ وہ اُسے جُوت پر شلو
کریں اور اُسے شرمسار بھی کریں۔ وہ آخر تمہارا بھائی ہے۔ کوئی بہن اپنے بھائی
کو خواہ وہ کیسا ہی ہو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

"آپ نقصان کی بات کرتے ہیں؟"۔۔۔ زبیدہ نے کچھ عجیب سے لہجے
میں کہا۔۔۔ "میں اُسے اپنے ہاتھوں پھانسی چڑھانا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب!
آج میں آپ کے ساتھ یہی بات کرنے آئی ہوں۔ آپ کے پاس آ کر مجھے روحانی
سکون ملتا ہے۔ میں یہ باتیں اپنے باپ کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ میں اُسے ان
دُکھوں سے بچا کر رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ اس بھائی نے ایک
ایسی حرکت کی ہے کہ میں نے اپنی زندگی اپنے لئے جہنم بنا لی ہے ....

"ڈاکٹر صاحب! کوئی دو مہینے گزرے میں سکول سے واپس آئی تو
میری ایک سہیلی نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ جو عورت مجھے بلانے آئی تھی اُس
نے کہا کہ بہت ضروری کام ہے۔ میں چلی گئی۔ میری سہیلی مجھے الگ کمرے

بس لے گئی اور بہت روئی۔ میں بڑی پریشان ہوئی کہ اُسے کیا مصیبت آ
پڑی ہے۔ اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے
ملنے میری غیر حاضری میں میرے گھر چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں اُسے میرا بدمعاش
بھائی مل گیا۔ وہ میری سہیلی کو یہ کہہ کر کہ زبیدہ ابھی آجائے گی ساتھ والے
کمرے میں لے گیا....

"اُس نے میری سہیلی سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ اس لڑکی نے اُسے
ھانے کی کوشش کی کہ وہ اُسے اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ آخر میرا بھائی زبردستی
پر اُتر آیا۔ اُس نے میری سہیلی کے مُنہ میں رومال ٹھونس دیا۔ پھر اُسے چاقو
دکھایا اور اُسے زبردستی بے آبرو کر دیا۔ میری سہیلی نے مجھے اپنے جسم پر
تشدد کے نشان بھی دکھائے۔ ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو کن الفاظ میں بتاؤں
کہ میری کیا حالت ہوئی۔ میں نے اپنی سہیلی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ تھانے
چلے لیکن میری سہیلی نے کہا کہ تم میرے باپ کو جانتی ہو کہ وہ کسی نہ کسی مرض میں
مبتلا رہتا ہے۔ اُس سے تو چارپائی سے اُٹھا بھی نہیں جاتا۔ اُسے پتہ چلا کہ
میرے ساتھ یہ حادثہ ہُوا ہے تو اُس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ باقی بہن بھائی
چھوٹے ہیں۔ میں کہاں ماری ماری پھروں گی....

"ڈاکٹر صاحب! میری سہیلی تو رو دھو کر چُپ ہو گئی لیکن میں اپنے
بھائی کے اس شرمناک جُرم کو ہضم نہ کر سکی۔ میرے ساتھ کی ایک استانی کا
بھائی وکیل ہے۔ میں رات کو اُس کے ہاں چلی گئی اور اُسے یہ واردات
سنائی۔ میں نے اُسے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کو سزائے موت
ہو جائے۔ وکیل نے کہا کہ عدالت میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو گا کہ میری
سہیلی کی بے عزّتی ہو گی اور یہ جُرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ یہ جُرم صرف اس
صورت میں ثابت ہُوا کرتا ہے کہ مجرم کو عین موقعہ پر پکڑ لیا جائے۔ اب اگر
میری سہیلی تھانے جائے گی تو تھانے والے بھی اُسے ٹرخانے کی کوشش
کریں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسے جُرم ثابت نہیں ہو سکتے....

"بہر حال ڈاکٹر صاحب! وکیل نے ایسی باتیں کہیں کہ میں مجبور ہو کر

وہاں سے چلی آئی۔ میں نے اپنے بھائی کو گالی گلوچ کی لیکن اُس نے صاف
لاعلمی کا اظہار کر دیا اور کہنے لگا کہ وہ لڑکی یہاں آئی ہی نہیں۔ میں نے اپنے
بھائی کو ڈرایا کہ میں اسے گرفتار کرا دوں گی۔ بھائی نے اس کے جواب میں کہا
کہ میں تم دونوں کو تھانے میں ہی اتنا ذلیل کروا دوں گا کہ تم ساری عمر پچھتاتی
رہو گی....

"ڈاکٹر صاحب! میرے دل میں بھائی کی جو نفرت تھی وہ انتقام کی آگ
بن گئی۔ کبھی یہ ارادہ کرتی کہ بھائی کو دھوکے سے زہر پلا دوں.... یہ سو رہا
ہو اور اس کی گردن پر چھُری پھیر دوں۔ ڈاکٹر صاحب! آپ اچھا سمجھیں یا بُرا
سمجھیں، میں نے اپنے بھائی کو سزا دینے کے لئے یہاں تک سوچا کہ ہمارے
محلّے میں دو زبردست بدمعاش ہیں میں انہیں کہوں کہ جو قیمت تم مانگتے ہو وہ
میں دے دوں گی تم میرے بھائی کو قتل کر دو۔ مجھ میں ایثار کا مادہ زیادہ ہے۔
میں نے جس طرح اپنے باپ اور بھائیوں کے لئے اپنی فطری زندگی قربان
کر دی ہے، اس طرح میں بھائی کو سزا دلانے کے لئے اپنی آبرو تک دینے
کے لئے تیار ہو گئی لیکن یہ خیال آگیا کہ یہ بدمعاش مجھے ساری عمر بلیک میل
کرتے رہیں گے....

"میں اپنے آپ کو جلانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی۔ یہ آپ بہتر سمجھتے
ہیں کہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے معدے کے اس عجیب وغریب مرض کے دَورے
پڑنے لگے۔ میرے دماغ میں انتقام لینے کی ایک ترکیب اور آئی۔ وہ یہ
تھی کہ میں تھانے میں یہ رپورٹ درج کرواؤں کہ میرا بھائی مجھ پر بُری نظر
رکھتا ہے اور دو مرتبہ اس نے رات کو جب میں سوئی ہوئی تھی، مجھ پر مجرمانہ
حملے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ میرا بھائی کس قماش
کا لڑکا ہے....

"میں پھر اسی وکیل کے پاس چلی گئی اور اُسے بتایا کہ میرا یہ ارادہ ہے۔
وکیل نے کہا کہ وکالت میرا پیشہ ہے۔ میرے پاس جو کوئی آتا ہے میں پیسے کمانے
کی خاطر اُسے کہتا ہوں کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہیں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہاں

یہ تم نے ٹھیک سوچا ہے لیکن تم میری بہن کی سہیلی ہو اس لئے میں تمہیں اپنی سگی بہن سمجھتا ہوں۔ یہ سوچ اور ارادہ ذہن سے نکال دو۔ ایسے الزام ثابت نہیں ہُوا کرتے۔ جیسا کہ تم بتاتی ہو کہ تمہارا بھائی بدمعاش ہے، وہ اُلٹا تمہارے خلاف مقدمہ کھڑا کر دے گا کہ تم نے اُسے ناحق ذلیل کیا ہے۔"

"وکیل نے تمہیں بالکل ٹھیک مشورہ دیا تھا"۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا۔۔۔ "زبیدہ بیٹی! ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ زہر کا پیالہ پینا ہی پڑتا ہے۔ بعض حادثات اور واقعات ایسے ہو جاتے ہیں جو صرف برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ بعض بڑی ہی تلخ حقیقتیں ایسی ہیں جن کا صرف یہ علاج ہے کہ انہیں قبول کر لو۔ تم خود کو نہ جلاؤ۔ میں اسی پہ زور دوں گا کہ شادی کرو اور اپنی زندگی بناؤ۔ جب کبھی سمجھو کہ تم اپنے ذہن پر قابو نہیں پا سکتیں، تو میں نے تمہیں جو گولیاں لکھ کر دی تھیں، وہ صرف ایک لے لیا کرو۔"

زبیدہ مایوسی کے عالم میں سر جھکاتے ہوتے چلی گئی۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد علی الصبح ڈاکٹر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ نوکر نے ڈاکٹر کو بتایا کہ چار پانچ آدمی ایک زخمی کو لائے ہیں جو بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر باہر نکلا۔ زخمی خون میں نہایا ہُوا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے گھر میں ہی دیکھا اور مایوسی سے کہا کہ اسے کسی ہسپتال لے جاؤ۔ زخمی کو لانے والوں نے بتایا کہ ہسپتال کی بجائے وہ اسے تھانے لے جائیں گے۔ اصل قصہ یہ تھا کہ زخمی ان کا کچھ نہیں لگتا تھا اور وہ آدمی زخمی کو پہچانتے ہی نہیں تھے۔ ان میں سے ایک صبح سویرے کہیں جا رہا تھا۔ اُس نے زخمی کو اس حالت میں وہاں پڑے ہوتے دیکھا۔ دو چار منٹ بعد یہ تین چار آدمی بھی وہاں جا کھڑے ہوتے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے قتل کرنے کے لئے زخمی کیا گیا ہے کیونکہ وہ ایسی جگہ پڑا تھا جہاں کوئی سڑک یا راستہ نہیں تھا کہ شک ہوتا کہ اُسے کوئی کار یا ٹرک کچل کر چلا گیا ہے۔

یہ کیس دراصل تھانے کا ہی تھا لیکن ان لوگوں نے دیکھا یہ کسی کا جوان بیٹا ہے، پہلے اس کے زخموں کی مرہم پٹی ہو جانی چاہیئے ورنہ یہ مر جائے گا۔ ڈاکٹر نے جو زخم دیکھے وہ بڑے بھیانک تھے۔ اس سے پتہ چلتا تھا

کہ یہ کسی کے بڑے ہی ظالمانہ انتقام کا شکار ہُوا ہے۔ اس کے چہرے سے ایک طرف کا گال کٹا ہُوا تھا۔ یہ شاید اس کا چہرہ مسخ کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اُس کے نازک اعضا کاٹ دیئے گئے تھے۔ خون اتنا زیادہ نکل گیا تھا کہ اُس کا بچنا ممکن نظر نہیں آتا تھا، اسی وجہ سے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اُسے ہسپتال لے جاؤ۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لانے والے چارپائی پر اٹھا کر لے گئے۔

تقریباً تین گھنٹے بعد ڈاکٹر کے پاس ایک کانسٹیبل یہ پیغام لے کر آیا کہ اُسے تھانے بلایا گیا ہے۔ ڈاکٹر تھانے گیا تو اُسے پتہ چلا کہ زخمی کو ہسپتال بھیج دیا گیا ہے اور ڈاکٹر کو اس لئے بلایا گیا تھا کہ اُس سے یہ تصدیق کرائی تھی کہ زخمی کو اٹھا کر لانے والے زخمی کو پہلے اُس کے پاس لے گئے تھے۔ وہ سب آدمی اس مصیبت میں گرفتار تھے کہ تھانیدار اُنہیں کہہ رہا تھا کہ اس آدمی کو انہوں نے خود ہی زخمی کیا ہے اور اب تھانے میں اٹھا لاتے ہیں۔ بہرحال ان لوگوں کی خلاصی ہو گئی لیکن انہیں بطور گواہ لکھ لیا گیا۔ ڈاکٹر کا بیان بھی قلمبند کر لیا گیا۔

اس واقعہ کے تین چار روز بعد زبیدہ ڈاکٹر کے پاس آئی۔

"ڈاکٹر صاحب!"۔۔۔ زبیدہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوتے کہا۔۔۔ "آج تیسرا دن ہے مجھے دورہ نہیں پڑا اور میں بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں۔"

"تمہاری شگفتگی بتا رہی ہے کہ تم نے شادی کر لی ہے"۔۔۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوتے کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!"۔۔۔ زبیدہ نے کہا۔۔۔ "میرے بھائی کو خدا نے وہی سزا دے دی ہے جو میں اُسے دلانا چاہتی تھی۔"

"وہ کیسے؟"

"کل تھانے سے ایک کانسٹیبل ہمارے گھر آیا"۔۔۔ زبیدہ نے کہا۔۔۔ "اُس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ناصر اس گھر کا لڑکا ہے؟ میں نے اُسے بتایا کہ وہ میرا بھائی ہے۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ وہ ہسپتال میں زخمی پڑا ہے۔ آج اُسے ذرا سی ہوش آئی ہے تو اُس نے اپنا آتا پتا بتایا ہے۔ میں اُسی وقت

اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ہسپتال گئی۔ ناصر کا سارا چہرہ پٹیوں میں لپٹا دیکھا۔ اُس کی آنکھیں اور مُنہ کھُلا ہُوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر رو پڑا۔ وہ آخر میرا بھائی ہے۔ اِس حالت میں اُسے دیکھ کر میرے بھی آنسو نکل آتے اُس نے یہی بات کہی کہ خُدا نے مجھے سزا دے دی ہے ....

"میں ڈاکٹر سے ملی اور اُس سے پوچھا کہ میرا بھائی کس حالت میں ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ میرا بھائی بچ گیا ہے اور زندہ رہے گا لیکن یہ باقی عمر تنہا زندگی گزارے گا۔ میں سمجھ نہ سکی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ایک تو اس کا آدھا چہرہ کاٹ دیا گیا ہے۔ اس زخم کو سی دیا گیا ہے لیکن ٹھیک ہونے کے بعد چہرہ بڑا ہی بھدّا لگے گا۔ دوسرے زخم نے اُسے کسی عورت کا خاوند ہونے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اس کے نازک اعضاء کاٹ دیتے گئے ہیں ....

"ڈاکٹر صاحب! اُس ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس لڑکے سے کسی نے بڑا ہی ظالمانہ انتقام لیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کی کون سی حرکت پر کسی نے انتقام لیا ہوگا۔ میری سہیلی کو اُس نے بے آبرو کیا تو وہ بے چاری مجبور ہو کر چُپ ہو گئی۔ میرے بھائی نے کسی ایسی لڑکی پر ہاتھ ڈالا ہوگا جس کے بھائی وغیرہ میرے بھائی سے زیادہ بدمعاش ہوں گے۔ اب میں جب بہن کے رُوپ میں آتی ہوں تو مجھے دُکھ ہوتا ہے کہ میرا بھائی بدصورت اور بیکار ہو گیا ہے لیکن جب میں ایک عورت کے رُوپ میں ہوتی ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ایک معصوم اور مظلوم لڑکی کی آہوں نے اِسے وہی سزا دی ہے جو ایک عورت ایسے مرد کو اپنے ہاتھوں دینا چاہتی ہے۔ اس سے مجھے ایک تسکین سی ہوتی ہے۔ شاید یہی میرا مرض تھا جو مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔"

اس کے بعد زبیدہ ڈاکٹر کے پاس کبھی نہ آئی۔

ردّی والے کی بیٹی

"اپنی کہانی سناتے مجھے ذرا سی بھی ندامت محسوس نہیں ہو رہی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھ سے آپ جو پوچھیں گی بتاؤں گی۔"

یہ الفاظ ایک خاتون کے ہیں جو اب دو بچوں کی ماں ہے۔ ایک بچّہ ڈیڑھ سال کا اور دوسرا آٹھ ماہ کا ہے۔ اُس کی عمر ابھی تیس سال نہیں ہوئی۔ ایسے لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں جو اپنی یا اپنے خاندان کی ذہنی پستی اور کجروی کا ذکر کرتے ہوں، بلکہ لوگ اپنی اصلیّت کو چھُپانے کے جتن کرتے رہتے ہیں۔ کوئی روپے پیسے کا پردہ ڈالتا ہے اور کوئی جھوٹ اور لاف زنی کا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو روپے پیسے سے محروم ہیں، وہ پارسائی اور صوم وصلوٰۃ کا ناٹک کھیل کر اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ بھی جھوٹ اور مبالغہ آرائی کا سہارا لیتے ہیں۔

یہ لوگ نفسیاتی مریض ہیں اور ان کے اندر اذیّت ناک تلخیاں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ اس سے ان کا مرض اور زیادہ پیچیدہ ہوتا رہتا ہے اور وہ اپنے لئے اور جن کے ساتھ ان کا تعلق یا رشتہ ہوتا ہے اُن کے لئے بڑا ہی تکلیف دہ مسئلہ بنے رہتے ہیں۔

نفسیات کا یہ مرض، اس کے اسباب اور اس کا علاج بڑا طویل موضوع ہے۔ میں آپ کو اس خاتون کی آپ بیتی اُسی کی زبانی سناتی ہوں۔ اپنی رائے صرف یہ دوں گی کہ اس خاتون جیسے لوگ اپنی خامیوں کو تسلیم کر کے ایک بڑے ہی خطرناک روگ سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

اس خاتون کی آپ بیتی سنانے سے پہلے ایک اور بات کہنا چاہتی ہوں۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے — کیا وعظ اور لیکچروں سے اخلاق اور کردار سدھارا جا سکتا ہے؟ — سائیکالوجی اس کا جواب نفی میں دیتی ہے اور سائیکالوجی اپنا یہ اصول بتاتی ہے کہ انسان کی ذات میں نیکی یا نیک اوصاف موجود ہوتے ہیں اور یہ اُس وقت بھی موجود ہوتے ہیں جب انسان کوئی بدی کر رہا ہوتا ہے، چوری کر رہا ہوتا ہے، کسی کو قتل کر رہا ہوتا ہے، جھوٹ بول رہا ہوتا ہے، رشوت لے رہا ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ جو حرکت کر رہا ہے اُسے یہی حرکت کرنی چاہیئے۔

سائیکالوجی یعنی علمِ نفسیات کا یہ اصول ایک مسلمان کے لئے نیا یا عجیب نہیں۔ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے اور انسانی فطرت کی یہ حقیقت کلامِ پاک میں آتی ہے کہ انسان کو خُدا نے نیکیوں کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اسے خدا نے قوّت دی ہے کہ وہ بدی کو یعنی شیطان کو شکست دے۔ ہوتا یوں ہے کہ حالات اور ماحول انسان پر عجیب و غریب طرح اثر انداز ہوتے ہیں لیکن انسان بیدار ہو جاتے تو وہ اِن اثرات سے آزاد ہو سکتا ہے اور اپنی زندگی کو جنّت بنا سکتا ہے۔

اس خاتون کے ساتھ جب ایک میری اور ایک اُس کی سہیلی نے ملاقات کرائی تو اُس کے ہونٹوں پر سکون اور اطمینان کی مُسکراہٹ تھی۔ اُس کے چہرے پر بڑی رونق تھی۔ وہ خوبصورت خاتون ہے لیکن اُس کا حسن سکون کی مُسکراہٹ اور چہرے کی رونق میں ہے۔ اُس نے بات شروع کی تو بڑی لمبی تمہید باندھی پھر پند و نصیحت شروع کر دی۔ میں نے اُس کا ہر لفظ بڑے غور سے سُنا کیونکہ مجھے دلچسپی اُس کے نفسیاتی پہلو سے تھی۔ وہ ہر بات اس لئے اچھی طرح کر سکتی ہے کہ تھوڑا بہت پڑھی ہوئی ہے۔ آپ کو میں اُس کی صرف کہانی سنا رہی ہوں۔

”میں نے جب ہوش سنبھالا تو میں سمجھ گئی کہ ہم غریب لوگ ہیں۔ جب میں اتنی بڑی ہو گئی کہ اچھے اور بُرے، سیاہ اور سفید، آگ اور پانی کو سمجھنے

کے قابل ہو گئی تو میں نے دیکھا کہ محلّے میں ہمارا گھر سب سے چھوٹا ہے اور اس گھر میں ضرورت کا سامان بھی پورا نہیں، لیکن ایک چیز ہمارے گھر میں موجود تھی۔ یہ تھا پیار اور محبّت۔ اکثر غریب گھرانوں میں غصّہ کسی اور وجہ سے ہوتا ہے جو نکلتا بچوں پر ہے۔ وہ کہاوت بالکل صحیح ہے کہ مفلسی بہت بڑا جُرم ہے۔ میرے خاندان کا جُرم اسی سے اُٹھا تھا لیکن ہمارے گھر لڑائی جھگڑا اور شور شرابہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم گوشت کا صرف ذائقہ جانتے تھے، پکتا کبھی ایک مہینے بعد تھا۔۔۔

”میرا باپ سارے شہر میں پھیری لگا کر گھروں سے ردّی، ٹین ڈبے، خالی بوتلیں، چھان بُورا اور روٹیوں کے باسی ٹکڑے خرید کر کباڑیوں وغیرہ کے ہاں بیچ آتا تھا۔ اسی لئے ہم 'ردّی والے' کہلاتے تھے۔ مجھے ردّی والوں کی بیٹی کہا جاتا تھا۔ مجھ سے دو بڑے بھائی تھے۔ میری ماں دو گھروں میں جھاڑو برتن کرتی تھی۔ باپ اُردو ذرا ذرا پڑھ سکتا تھا اور پہلی دوسری جماعت کے بچّوں کی طرح لکھ بھی سکتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ اُسے پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن چوتھی جماعت میں تھا تو اُس کا باپ مر گیا اور اُسے اسی عمر میں ادھر اُدھر نوکری کرنی پڑی۔ وہ کسی کباڑی کے ہاں نوکر ہُوا تو وہاں سے اُس نے ردّی کی خرید و فروخت شروع کی تھی۔۔۔

”اُس نے پڑھنے کے شوق کو اس طرح زندہ رکھا کہ میرے دونوں بھائیوں کو اُس نے سکول میں داخل کرا دیا اور جب میں اُس عمر کو پہنچی تو مجھے بھی سکول داخل کرا دیا۔ یہ احساس میرے دل میں ضرور رہا کہ ہم غریب ہیں لیکن میں نے کبھی کوئی محرومی یا کسی قسم کی بھوک محسوس نہیں کی۔ ہاں، کبھی کسی خوبصورت مکان پر نظر پڑتی تو دل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ ہم بھی ایسے مکان میں رہیں لیکن یہ خیال آجاتا تھا کہ خدا نے ہر ایک کی قسمت الگ الگ لکھی ہے۔ یہ تو میں نے کچھ اور بڑے ہو کر دیکھا کہ ان اچھے مکانوں میں رہنے والے کئی لوگ جنہیں خُدا نے ہر ایک سہولت دے رکھی ہے اور وہ ہر روز گوشت کھاتے ہیں، مُرغی اور مچھلی بھی کھاتے ہیں، ان کے گھروں میں دلی یا روحانی خوشی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ 'ابھی اور'

کے لالچ میں پریشان رہتے ہیں ....

"میری بعض ہم جماعت لڑکیاں تھیں جن کے ماں باپ امیر تھے یا ہماری طرح غریب نہیں تھے۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ ان کے ماں باپ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ بعض گھروں میں لڑائی پٹائی بھی ہوتی تھی۔ میری ماں جن گھروں میں جھاڑو برتن کرتی تھی وہ خوشحال لوگ تھے لیکن میری ماں اُن کی اور ایسے بعض دوسرے گھروں کی باتیں سُناتی تو میں حیران ہُوا کرتی تھی کہ امیر کبیر ہوکر بھی یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں ....

"میری ماں محنت اور مشقت کے علاوہ گھر کا کام کرتی، تین بچوّں کو سنبھالتی، پھر بھی خوش رہتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرا باپ اُسے خوش رکھتا تھا۔ اپنے باپ کی آپ کو بتاتی ہوں۔ شاید ہر بیٹی کو اپنا باپ اچھا لگتا ہو گا اور ہر بیٹی اپنے باپ کو خوبصورت آدمی سمجھتی ہو گی لیکن میرا باپ تھا ہی بڑی اچھی شکل وصورت کا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے اسے معلوم ہی نہیں کہ غصّہ کیا ہوتا ہے۔ باتوں سے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے چار جماعتیں بھی پوری نہیں پڑھیں۔ ہنس مُکھ تھا اور مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ باہر لوگوں میں ہر دل عزیز بھی ہے۔ کچھ اور بڑے ہو کر میں نے دیکھا کہ میرا باپ چالاک اور ہوشیار بھی ہے ....

"ایک روز باپ نے ہمیں یہ خوشخبری سُنائی کہ اُس نے کباڑی بازار میں کھوکھے کی طرح کی ایک دکان کرائے پر لے لی ہے اور اب وہ رّدی کے لئے پھیری لگانے کی بجائے پھیری والوں سے رّدی وغیرہ خریدا کرے گا۔ چند ہی مہینوں بعد اُس نے میری ماں سے دوسرے گھروں کا کام چُھڑوا دیا کیونکہ دکان سے بڑی اچھی آمدنی شروع ہو گئی تھی۔ ایک رات میں ابھی جاگ رہی تھی، میرا باپ میری ماں سے کہہ رہا تھا کہ بڑا اچھا ذریعہ پیدا ہو رہا ہے۔ اب کاروبار کا مزہ آئے گا ....

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا، کہ میرا باپ ہنس مکھ، ملنسار، چالاک اور ہوشیار تھا۔ اُس نے ان اوصاف سے کسی پیسے والے آدمی کو اپنے کاروبار

میں شامل کر لیا تھا۔ تین چار مہینوں بعد باپ نے ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ اُسے ایک بڑی دکان کرائے پر مل گئی ہے اور اُس نے لنڈے کے کپڑوں کی کچھ گانٹھیں خرید لی ہیں۔ اب اس کے ساتھ پیسے والا ایک حصّہ دار بھی تھا۔ ایک روز یہ آدمی ہمارے گھر آیا تھا۔ اُس کے جانے کے بعد میری ماں نے میرے باپ سے کہا تھا کہ یہ تو بالکل سیدھا ہے۔ میرے باپ نے ماں کو آنکھ کا اشارہ کر کے اور مُسکرا کر کہا تھا۔ 'اسی لئے تو اسے ساتھ ملایا ہے'۔ اُس وقت میں چھوٹی تھی، انسانوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ بہت بعد میں جب ہمارے گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہو گئی تو میں سمجھی کہ میرے باپ نے اتنے سیدھے آدمی کو کیوں اپنے کاروبار میں شریک کیا تھا۔ وہ سیدھا سادہ تھا اور میرا باپ چالاک ....

"ہمارے گھر سے غربت نکلنے لگی اور ہم امریکہ کے سِلے ہُوئے کپڑے پہننے لگے۔ باپ جب لنڈے کے کپڑوں کی گانٹھیں کھولتا تھا تو سب سے اچھے کپڑے گھر لے آتا تھا۔ یہ ہم پہنتے تھے۔ میں آپ کو ایک اور بات بتاتی ہوں۔

لنڈے کے کپڑے تو ہر کوئی پہنتا ہے، بہت سستے ملتے ہیں لیکن یہی کپڑے کاروں اور کوٹھیوں والے بھی پہنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لنڈے کے نہیں۔ وہ صحیح کہتے ہیں۔ وہ حقیقت سے واقف نہیں ہوتے۔ لنڈے میں جب امریکہ کی اُترن کی گانٹھیں آتی اور کھُلتی ہیں تو ان میں اکثر کوٹ پتلونیں، گاؤن، اوورکوٹ اور سویٹریں اتنی اچھی ہوتی ہیں جیسے انہیں کسی نے ایک بار بھی نہیں پہنا۔ یہ کپڑے شہر کی اُن دکانوں میں پہنچ جاتے ہیں جہاں صرف کاروں والے گاہک جانے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ یہی کپڑے ڈرائی کلین اور پریس کر کے شیشے کے شوکیسوں میں رکھ دیئے جاتے ہیں اور جب ان پر ٹیوبوں اور مرکری بلبوں کی روشنی پڑتی ہے تو ان کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔ گاہک انہیں ریڈی میڈ سمجھ کر سینکڑوں روپیوں کی قیمت دے کر خریدتے ہیں ....

"میرے باپ نے شہر کی ایسی دو تین دکانوں سے تعلق قائم کر لیا تھا۔

انہیں وہ لنڈے میں بکنے والی دس روپے کی چیز اُسی سے ایک سو روپے تک دیتا اور دکاندار اُسے اڑھائی تین سو روپے میں بیچتا تھا۔ اس کاروبار نے ہمارے گھر کی کایا پلٹ دی۔ میری ماں نے گھر اپنا کاروبار چلا لیا۔ وہ اچھے اچھے کپڑے جن پر ذرا بھی داغ اور میل نہیں ہوتی تھی، لوگوں کے گھروں میں لے جاتی اور بتاتی کہ اس کا ایک رشتہ دار باہر سے لایا ہے۔ عورتیں اچھے پیسوں میں یہ کپڑے خرید لیتی تھیں....

"میں اُس وقت آٹھویں جماعت میں تھی۔ میرا ایک بھائی دسویں جماعت میں اور دوسرا اسیکنڈ ائیر میں تھا۔ ابھی ہم اسی چھوٹے سے غریبانہ مکان میں رہتے تھے اور لوگ اسے ردّی والوں کا گھر ہی کہتے تھے، لیکن ہم اب غریب نہیں تھے۔ گھر میں ایک بھی چارپائی پرانی نہیں رہی تھی۔ دو نئے زمانے کے پلنگ بھی آ گئے تھے۔ چھوٹا سا صوفہ سیٹ بھی آ گیا تھا۔ اب ہم کمبل یا بوری پر بیٹھ کر نہیں بلکہ میز کرسیوں پر بیٹھ کر لکھتے پڑھتے تھے۔ میری ماں اب دھلی دھلائی رہتی تھی اور مجھے بھی بنا سنوار کر رکھتی تھی۔ ہمارے تو دن پھر گئے تھے، مگر ہم 'ردّی والے' کہلاتے تھے۔ یہی ہماری پہچان تھی....

"میں جب آٹھویں جماعت میں پہنچی تھی تو میری منگنی کر دی گئی تھی۔ میں لڑکے کو بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس کے سارے خاندان کو جانتی تھی۔ لڑکے کا نام شہزاد تھا۔ اُس وقت دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُس کا باپ کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔ کسی مشین پر کام کرتا تھا۔ شریف گھرانہ تھا۔ شہزاد پڑھنے میں بڑی محنت کرتا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ شہزاد کا خاندان امیر ہے یا غریب۔ لڑکا مجھے اچھا لگتا تھا۔ اُس کی یہ بات ہمارے محلے تک مشہور تھی کہ وہ کہا کرتا تھا کہ ایم۔ اے کر کے باپ کو کام سے چھٹی کرا دوں گا۔ یہی وہ عزم تھا جس نے اُسے تعلیم میں مگن کر رکھا تھا....

"ایک روز میرا باپ گھر آیا تو اُس نے بڑی خوشی سے میری ماں سے کہا — 'اُسے چھٹی کرا دی ہے.... چلتا کر دیا ہے' — وہ اپنے حصّہ دار کی بات کر رہا تھا جس نے دکان میں سرمایہ لگایا تھا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو

سکا نہ میں نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ اس حصّہ دار کو میرے باپ نے کس طرح چلتا کیا تھا کہ اُس کا پیسہ بھی دبا لیا تھا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ میرا باپ چالاک تھا اور وہ آدمی سیدھا سادہ اور شریف۔ اس کے بعد میرے باپ نے نیا مکان بنانے کی باتیں شروع کر دیں۔ لوگ دبئی جا کر دولت مند بنتے ہیں، ہمارے لئے لنڈا ہی دبئی بن گیا....

"ایک صبح ابھی اندھیرا تھا، ہمارے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دروازہ کھولا تو ایک آدمی کی آواز آئی — 'او ئے تیری دکان جل کر راکھ ہو گئی ہے' — میرا باپ باہر کو دوڑ پڑا۔ میرے بھائی بھی جاگ اُٹھے تھے۔ وہ بھی باپ کے پیچھے گئے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ گھر میں رہ گئی۔ ہم دونوں رونے بیٹھ گئیں۔ ماں کہتی تھی کہ پچاس ساٹھ ہزار کا مال دکان میں پڑا تھا۔ اُس وقت کے پچاس ساٹھ ہزار آج کے چھ سات لاکھ روپے کے برابر تھے۔ مجھے گھر میں پھر غربت نظر آنے لگی۔ میں نے ماں سے تو نہ کہا، میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہمیں اُس آدمی کی بد دُعا لگی ہے جس کا روپیہ میرے باپ نے دبا کر اُسے کاروبار سے الگ کر دیا ہے....

"شام کو میرا باپ اور بھائی گھر واپس آئے۔ بھائیوں نے بتایا کہ بجلی کے ننگے تاروں سے شاید آگ لگی تھی۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ بچنا کیا تھا، اندر کپڑے ہی کپڑے رکھے تھے۔ میرے بھائی پریشان تھے مگر میرے باپ کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ اُسے دیکھ کر میں اور میری ماں بچوں کی طرح روتی تھیں۔ باپ میری ماں کو اشارے سے کمرے میں لے گیا۔ ماں جب باہر آئی تو اُس کے آنسو خشک تھے۔ اُس نے مجھے کہا — 'غم نہ کر بیٹی! اللہ نقصان جلدی پورا کر دے گا' — میں نہ سمجھ سکی کہ ماں کو کس طرح صبر آ گیا ہے....

"اتنی لمبی بات کیا سناؤں۔ مختصر سُن لو۔ میرا باپ تھا تو اَن پڑھ لیکن پیسہ کمانے کے سارے راستے جانتا تھا۔ اُسے شاید کوئی تعلیم یافتہ مشیر مل گیا تھا۔ اُس نے دکان اور مال کی انشورنس کرا رکھی تھی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ باپ نے بے شمار کپڑوں کی گانٹھیں گھر میں کیوں رکھ دی تھیں۔ آدھا کمرہ اور آدھا برآمدہ

بھر گیا تھا۔ دکان میں خالی بوریاں اور بے کار کپڑے تھے۔ ہمارے گھر میں تین بار دو آدمی آتے تھے جنہوں نے کوٹ پتلون پہن رکھے تھے۔ وہ بہت دیر میرے باپ کے ساتھ الگ کمرے میں بیٹھے رہے تھے....

"تین مہینوں بعد باپ مٹھائی کا ڈبّہ اُٹھاتے گھر آیا۔ اُس نے خوشخبری سنائی کہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ مل گیا ہے۔ اُس نے گھر رکھا ہُوا مال اٹھوایا اور دکان میں لے گیا.... اُس روز کے بعد ہمارے گھر میں نوٹ اُڑنے لگے، یا ایسے کہہ لیں کہ نوٹ ہمارے گھر میں اُڑ اُڑ کر اس طرح آنے لگے جیسے آندھی کا رُخ اِدھر کو ہی ہو، اور جو آندھی نوٹ اُڑا کر ہمارے گھر لائی تھی وہ ہمارے گھر سے شرافت اور تہذیب اُڑا کر لے گئی۔ اُس کی جگہ فیشن اور شو بازی آگئی....

"میں نے تو باہر نکل کر کبھی نہیں دیکھا تھا کہ میرے باپ کی دکان کیسی اور کاروبار کتنا بڑا ہے۔ میں صرف وہ پیسہ دیکھ رہی تھی جو 'ردّی والوں' کے گھر آ رہا تھا۔ میں دسویں جماعت میں تھی تو محلّے سے دُور نیا گھر بن گیا۔ یہ کوٹھی تھی۔ پُرانا مکان بیچ دیا گیا۔ میرا اور میرے بھائیوں کا لباس بدل گیا۔ چھوٹا بھائی بھی کالج میں چلا گیا تھا۔ دونوں بھائی ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے سکوٹر خرید لیا۔ اس پر وہ اکٹھے کالج جاتے تھے — اور اس سکوٹر پر وہ اُس دُنیا میں پہنچ گئے جہاں یورپ کی تہذیب تھی، فیشن تھا اور جہاں شرم اور جھجک کو پسماندگی سمجھا جاتا تھا....

"میری ماں کے چہرے پر جوانی ختم ہو چکی تھی لیکن وہ رنگدار اور پھولدار کپڑے پہن کر، سرخی پوڈر لگا کر اور اپنی اصلیت بھُول کر جوان بننے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک روز ہمارے باپ نے مجھے اور میرے بھائیوں سے کہا کہ اب پُرانی عادتیں اور پُرانے خیال دماغ سے نکال دو۔ ہم اب ردّی والے نہیں رہے۔ باہر میری بہت عزّت ہے۔ تم بھی کوٹھیوں والوں کی طرح رہو۔ میں تمہیں اُس گندے محلّے سے نکال کر دُور لے آیا ہوں۔ کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ ہمارا باپ کبھی ردّی فروش ہُوا کرتا تھا....

"مجھے وہ وقت یاد تھا جب میں سکول جاتی تو میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اب ہر روز میرے پاس چار پانچ روپے ہوتے اور جو جی میں آتا کھاتی اور جسے چاہتی کھلاتی تھی۔ میرے بھائیوں کی مالی حالت مجھ سے زیادہ بہتر تھی۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو گھر لانا شروع کر دیا۔ ہمارے گھر میں اب ٹی۔ وی تھا، فریج بھی آگیا تھا اور ویسا ہی فرنیچر تھا جیسا کوٹھیوں میں ہوتا ہے۔ میرے بھائی اور اُن کے دوست ڈرائنگ روم میں خوب ہلڑ بازی کیا کرتے تھے اور میرے ماں باپ خوش ہوتے تھے کہ لڑکے ماڈرن ہو گئے ہیں....

"میرا ماڈرن بننا رہ گیا تھا۔ وہ میں کالج میں جا کر بن گئی۔ میرے بھائیوں نے مجھے ماڈرن بننے میں بہت مدد دی تھی۔ میرا بڑا بھائی بی اے میں فیل ہو گیا تو باپ نے اُسے اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لیا۔ اُس نے موٹر سائیکل خرید لیا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ لنڈے کے کپڑوں کے علاوہ اُن کا کوئی اور کاروبار تھا یا نہیں۔ البتہ یہ شک اُس وقت تھا اور آج بھی ہے کہ میرا بھائی دکان پر کم ہی بیٹھتا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اُس کا کوئی درپردہ کاروبار بھی تھا۔ پُرانے کپڑوں سے اتنا روپیہ نہیں آسکتا کہ اس بے دردی سے اڑایا جاتے جس طرح میرے بھائی اُڑا رہے تھے....

"کالج میں مَیں بھی اسی رنگ میں رنگی گئی۔ آپ نے سائیکالوجی میں ایم۔ اے کیا ہے۔ آپ میری ہر ایک بات اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں۔ ہم دراصل اپنے اوپر سے 'ردّی والا' لیبل اتار رہے تھے۔ آپ نے کالج دیکھا ہے۔ یونیورسٹی بھی دیکھی ہے۔ نیو کیمپس بھی دیکھا ہے۔ آپ کو میں کیا بتاؤں میں کس طرح نہر کے کنارے تک پہنچی تھی۔ آپ تو سب کچھ جانتی ہیں۔ آپ اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گی کہ یورپ کے ہپّیوں کی تہذیب میں رنگے ہوئے پاکستانی نوجوان اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی بہنوں کا تبادلہ کیا کرتے ہیں۔ بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی بہنوں کا تعارف

کراتے ہیں۔ ایک دوسرے کی دعوتیں گھروں میں اور ہوٹلوں میں کرتے ہیں۔ وہ شرافت کی کوئی بات نہیں کرتے۔ وہ ہپیوں کی طرح ناچتے کودتے اور ہلّہ گلّہ کرتے ہیں ....

"بھائیوں نے مجھے بھی اس راستے پر ڈال دیا۔ میں یورپی ہوٹلوں میں گئی۔ بھائیوں کے دوستوں کی بہنوں سے ملی۔ ان میں بعض لڑکیاں 'ایڈوانس' سے آگے نکل گئی تھیں۔ کچھ عرصہ مجھ پر جھینپ سی طاری رہی۔ یہ کمتری کے احساس کی وجہ سے تھی۔ ذہن سے یہ خیال نہیں نکلتا تھا کہ میں 'ردّی والے' کی بیٹی ہوں۔ میرے ماں باپ نے یہ لیبل اتارنے کے لئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ میری منگنی توڑ دی تھی۔ وہ محلّوں میں رہنے والوں سے رشتے توڑ رہے تھے۔ اب کسی فیکٹری کے ورکر کا بیٹا میرا دولہا نہیں بن سکتا تھا۔ اس فیصلے سے مجھے خوشی ہوئی....

"ایک روز یوں ہوا کہ میں کالج سے نکلی تو گیٹ پر شہزاد کھڑا تھا۔ مجھے اُس سے نفرت تو نہیں تھی کہ میں اُس سے نہ ملتی۔ وہ اب بھی مجھے اچھا لگتا تھا لیکن ہمارے سٹینڈرڈ کا نہ ہونے کی وجہ سے میری اُس کے ساتھ شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں اُسے ملی۔ وہ بہت سنجیدہ تھا۔ کہنے لگا — 'میں تمہارے لئے کھڑا تھا۔ میں تم سے یہ درخواست کرنے نہیں آیا کہ اپنے والدین کو مجبور کرو کہ تمہاری شادی میرے ساتھ ہی ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ میرا تمہارا اب کوئی جوڑ نہیں۔ میں تمہیں اس راستے سے ہٹانے آیا ہوں جس راستے پر تم چل پڑی ہو'....

"مجھے اُس پر غصہ نہ آیا۔ ہنسی بھی نہ آئی۔ افسوس سا ہوا کہ اچھا خاصا ذہین لڑکا غربت کی وجہ سے پسماندہ رہ گیا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میری عزّت اور عصمت بالکل محفوظ ہے لیکن میں ایسی سوسائٹی کی لڑکی ہوں جس میں سوسائٹی کا خیال رکھنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ ہمارا میل ملاقات ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہے ....

"اُس نے کہا — 'تم کسی اور سوسائٹی کی لڑکی ہو۔ اُسے نہ بھولو۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تمہیں خبردار کردوں۔ ایک دن آئے گا کہ جو عزّت اور

عصمت تم نے ابھی تک محفوظ رکھی ہوئی ہے یہ محفوظ نہیں رہے گی اور تم کہو گی کہ یہ بھی تمہاری سوسائٹی کا تقاضا ہے'....

"اُس کی یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ میں نے ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ میں یہ سمجھ گئی کہ شہزاد جو کچھ کہہ رہا ہے نیک نیتی سے کہہ رہا ہے۔ میں نے اُسے گول مول سا جواب دیا۔ وہ جب جانے لگا تو میں نے اسے کہا — 'شہزاد! بُرا نہ ماننا۔ اگر تمہیں ذاتی خرچ کے لئے پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو' — میں نے اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی اور اُس نے آہستہ سے سر ہلایا کہ نہیں۔ میں نے کہا — 'میں تمہیں غریب سمجھ کر تمہاری مالی امداد نہیں کر رہی۔ جس طرح تم نے اپنا فرض سمجھا ہے کہ مجھے اس راستے سے ہٹاؤ، اسی طرح میں اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ تمہیں کم از کم مالی تنگی محسوس نہ ہونے دوں' — اُس نے آہ بھری اور بولا — 'ضرورت ہوئی تو مانگ لوں گا'....

"میں نے اُردو فلمیں تو بہت دیکھی تھیں، انگریزی فلم کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دو سہیلیوں کے ساتھ پہلی انگریزی فلم دیکھی تو مجھے کچھ اچھی نہ لگی۔ اس کے بعد سہیلیوں کی ضد پر ہی دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ یہ فلمیں مجھے اچھی لگنے لگیں۔ میں ابھی کسی لڑکے کے ساتھ اکیلی باہر نہیں گئی تھی نہ سوچا تھا کہ کبھی جاؤں گی۔ پکنک پر جاتی تو بھائی ساتھ ہوتے تھے اور اُن کے دوستوں کی بہنیں بھی ہوتی تھیں....

"میں سیکنڈ ائیر میں تھی جب لڑکیوں نے مجھے اپنی اپنی محبت کی کہانیاں سنانی شروع کردیں لیکن یہ ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں والی محبت نہیں تھی۔ یہ 'تم نہیں اور سہی' والی کہانیاں تھیں۔ پھر ان کہانیوں میں فحش کلامی بھی شروع ہوگئی اور پھر میں نے ننگے ناول پڑھے۔ پھر بالکل ننگی تصویریں دیکھنے کو ملیں۔ یہ ناول، انگریزی کے ننگے رسالے اور ننگی تصویریں لڑکیوں میں گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔ انہیں لڑکے لا کے دیتے تھے....

"گھر میں اب یہ حالت تھی کہ میرے بھائی رات کو دیر سے گھر آئیں یا میں آخری شو دیکھ کر آؤں، ماں باپ کی طرف سے باز پُرس نہیں ہوتی تھی۔ صرف ایک بار ماں نے مجھے کہا تھا کہ ان لڑکوں سے اپنا آپ بچا کر رکھنا۔ انہی میں

سے کسی کے ساتھ تمہاری شادی ہوگی۔ اب ہم گلیوں اور محلّوں میں تو تمہارا رشتہ نہیں دے سکتے۔ کسی اچھے گھرانے کا کوئی لڑکا پسند کر لینا....

"ماں کی یہ بات مجھے اچھی لگی لیکن وہ جو ناول اور انگریزی رسالے مجھے پڑھائے گئے تھے اور جو تصویریں مجھے دکھائی گئی تھیں، اُنہوں نے میرے جسم میں ایک تبدیلی پیدا کر دی تھی جیسے ساری دنیا کا موسم بدل گیا ہو۔ اس دوران شہزاد مجھے چھ سات مرتبہ ملا اور اُس نے وہی نصیحت دُہرائی جو اُس نے پہلے روز کی تھی۔ میں نے اُسے کبھی بھی منع نہ کیا کہ وہ مجھے ایسی باتیں نہ کہا کرے۔ میں اُس کی نیّت کو سمجھتی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ پسماندہ سوسائٹی کا آدمی ہے، اس لئے میری سوسائٹی کے تقاضوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ میں اُس کا شکریہ ادا کرتی تھی اور میں نے اُسے ہر بار کہا کہ وہ مجھ سے پیسے لے لیا کرے۔ وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرتا اور چلا جاتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ ہمدردی سی ہوگئی تھی....

"میں تھرڈ ائیر میں چلی گئی۔ میں نے ماں کے کہنے کے مطابق ایک نوجوان پسند کر لیا تھا۔ اُسے میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اُس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا، پھر ہم ملنے ملانے لگے جسے کورٹ شپ کہتے ہیں۔ اُس کا باپ ایسے محکمے میں افسر تھا جہاں بالائی آمدنی بہت تھی۔ ڈیڑھ دو مہینے تو ہماری ملاقاتیں کسی نہ کسی ہوٹل میں یا کالج کے باہر دن کے وقت ہوتی رہیں۔ ایک روز اُس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے انگریزی پکچر دکھانا چاہتا ہے۔ وہ دوسرے شو کے لئے کہہ رہا تھا۔ میں شام کے بعد کسی لڑکے کے ساتھ کبھی اکیلی نہیں گئی تھی لیکن اس کے ساتھ میری محبت تھی اور شادی تک کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں آ جاؤں گی۔ اُس وقت تک میرے بھائی مکمل ہپی بن چکے تھے....

"اُس نے جہاں کہا تھا میں وہاں پہنچ گئی۔ وہ کار لایا تھا۔ اُس کے ساتھ اُسی جیسا ایک دوست بھی تھا۔ وہ مجھے ایک سینما ہال میں لے گئے۔ میں نے انگریزی فلمیں تو کئی دیکھی تھیں اور ان کی عریانی بھی دیکھی تھی

لیکن اس فلم میں بے حیائی اور عریانی کے سوا تھا ہی کچھ نہیں۔ یہ کوئی اچھی قسم کا سینما ہال نہیں تھا۔ وہاں نیچے والی کلاسوں میں جو لوگ بیٹھے تھے وہ تالیاں بجاتے، ننگے فقرے بولتے اور بہت شور کرتے تھے۔ بار بار ایک شور اُٹھتا تھا — 'او چلاؤ او تے .... او چلاؤ او تے' — میں نے پوچھا کہ یہ کیسے نعرے ہیں؟ میرے دوست نے کہا — 'ابھی تمہیں پتہ چل جائے گا'....

"اور مجھے پتہ چل گیا۔ آپ نے بلیو پرنٹ سُنا ہوگا۔ یہ فلم چل پڑی۔ تماشائی اسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میرا پسینہ نکل آیا۔ میرے دوست نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، پھر میری جھینپ ختم ہوگئی اور مجھ پر اس ننگی فلم نے خمار طاری کر دیا۔ مجھے جیسے ہوش ہی نہیں تھا کہ پکچر کب ختم ہوئی اور ہم کس وقت اور کس طرح باہر نکلے۔ مجھے اُس وقت ذرا ہوش آئی جب کار نہر کے کنارے کنارے نیو کیمپس کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ اُس نے کہا ذرا ٹھنڈی ہوا لگوانے، جسم تپ رہا ہے۔ پچھلی سیٹ پر اُس کا دوست بیٹھا ہوا تھا....

"کار کیمپس سے دُور آگے جا رُکی اور ہم نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی میرے دوست نے میرے ساتھ چھیڑ خانی شروع کر دی۔ میں نے اُسے پرے کیا اور اُس کے دوست کی طرف اشارہ کیا کہ اُس کی موجودگی میں ایسا نہ کرے لیکن وہ تو جیسے اپنے آپ میں تھا ہی نہیں۔ یہ بلیو پرنٹ کا اثر تھا۔ میں نے اُسے پھر منع کیا تو اُس کے دوست نے پیچھے سے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ میرے دوست نے مجھے بلیو پرنٹ جیسی ننگی بات کہہ دی۔ اب آپ سمجھنے کی کوشش کریں کہ مجھ میں یہ تبدیلی یعنی ایڈوانس بننے کی تبدیلی تین چار سالوں میں آئی لیکن میں ایک سیکنڈ میں وہاں پہنچ گئی جہاں ہم رَدّی والے کہلاتے تھے۔ میں اپنی جس اصلیت پر اس ننگی تہذیب اور ایکٹنگ کا پردہ ڈال رہی تھی وہ میرے سامنے آگئی اور شاید یہی میری طاقت بن گئی....

"میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے غصّے سے کہا کہ مجھے واپس لے چلو۔ دونوں

نے پیار سے بہلانے اور ورغلانے کی کوشش کی لیکن میرا غصہ بڑھتا گیا۔ میرے دوست نے اپنے دوست سے کہا، گرا لو اِسے۔ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ اُس نے مجھے سامنے آکر بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ نہر میں جا پڑا۔ میں جُوڈو کراٹے تو بالکل نہیں جانتی تھی لیکن خُدا نے مجھے طاقت دے دی تھی۔ دوسرے نوجوان نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے انگریزی فلموں کی طرح اُس کے ہونٹوں پر سیدھا گھونسہ مارا۔ وہ میرا بازو چھوڑ کر پیچھے کو گرا۔ وہ اُٹھ رہا تھا تو میں نے اُس کے کان کے قریب کِک ماری۔ وہ پھر لیٹ گیا اور میں وہاں سے دوڑ پڑی....

"اُس وقت وہ علاقہ بالکل ویران ہُوا کرتا تھا۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں گھر سے کتنی دُور ہوں۔ میں دوڑتی گئی۔ میں ہانپ گئی اور مجھے آواز سنائی دی — 'کون ہے او' — کوئی میری طرف آرہا تھا۔ اب مجھے ڈر سا لگا کہ یہ کوئی غنڈہ بدمعاش ہوگا۔ اس ویرانے میں ان سے کس طرح بچوں گی۔ میں چُپ چاپ بُت کی طرح کھڑی ہوگئی۔ دو آدمی میرے قریب آئے۔ وہ پولیس کی وردی میں تھے۔ کہتے تھے کہ اُن کی گشت کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ ان میں ایک پُرانی عمر کا لگتا تھا۔ میں رو پڑی اور اُنہیں بتایا کہ دو لڑکے دھوکے سے مجھے یہاں لے آتے تھے اور مَیں اُن سے عزّت بچا کر بھاگی ہوں....

"خدا میری مدد کے لئے آگیا تھا۔ پُرانی عمر کے کانسٹیبل نے کہا — 'یہاں تم جیسی لڑکیاں ہر رات ورغلائی ہُوئی آتی ہیں۔ معلوم نہیں تم بھاگ کیوں رہی ہو۔ جو پکڑی جاتی ہے وہ کہتی ہے کہ یہ مجھے دھوکے سے لے آتے تھے'۔ اُس کی بات میں طنز تھی۔ اس سے میں گھبرا گئی۔ اتنے میں اُدھر سے کار آئی جدھر سے میں آئی تھی۔ میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ انہی کی کار ہے۔ ہمارے قریب آکر کار آہستہ ہوئی پھر تیز ہوگئی اور نکل گئی۔ یہ میرے دوست کی کار تھی....

"دونوں کانسٹیبل میرے ساتھ چل پڑے۔ اُن کے پُوچھنے پر میں نے انہیں بتانا شروع کر دیا کہ میں ایک چھوٹے سے مکان سے کار میں نہر کے کنارے تک کس طرح پہنچی ہوں۔ پُرانے کانسٹیبل نے بیٹی کہہ کر مجھ سے بات کی اور پند و نصیحت کرنے لگا۔ ہم چلتے جا رہے تھے اور کیمپس کے پُل تک پہنچ گئے۔ باتوں میں فاصلے کا کچھ پتہ نہ چلا۔ وہاں چونکہ ہوسٹل ہے اس لئے رات کو کوئی نہ کوئی رکشا وہاں چلا جاتا ہے۔ اسے میں خدائی مدد کہوں گی کہ ایک رکشا آگیا۔ ہوسٹل میں سواریاں اُتار کر واپس آگیا۔ میں اس میں بیٹھ گئی۔ پُرانے کانسٹیبل نے مجھے کہا — 'اپنی اصلیت کو پھر کبھی نہ بھولنا۔ ساری عمر سُکھی رہو گی'....

"میں گھر پہنچی تو کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں آدھی رات تک کہاں رہی ہوں۔ اُس رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں نے رات کو اپنی زندگی کا فیصلہ کر لیا۔ صبح کالج گئی مگر یونیورسٹی چلی گئی جہاں شہزاد پڑھتا تھا۔ اُسے ملنا تھا۔ کچھ انتظار کے بعد مل گیا اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سمجھا میں کسی کام سے آئی ہوں اور ویسے ہی اُسے مل گئی ہوں مگر میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ گھبرا گیا اور پوچھنے لگا کہ کیا ہُوا ہے۔ میرے مُنہ سے نکلا — 'وہ راستہ چھوڑ کر تمہارے راستے پر آگئی ہوں'....

"میں اُسے الگ لے گئی اور اُسے صاف صاف بتا دیا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔ مَیں نے اُسے کہا کہ میں اب اُسی کی ہو کے رہوں گی۔ اس موضوع پر ہماری بہت باتیں ہوئیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ میرے والدین تھے۔ میں نے شہزاد کو آمادہ کر لیا تھا۔ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو میں نے دھمکی دی کہ وہ شہزاد کو قبول نہیں کریں گے تو میں گھر سے نکل جاؤں گی۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کے لئے بہت کچھ کہا۔ یہ بھی کہا کہ ہم بڑی اُونچی حیثیت کے لوگ ہیں اور شہزاد کا گھرانہ بڑا غریب ہے۔ مَیں نے ایک ہی رَٹ لگائے رکھی کہ میں رَدّی والے کی بیٹی ہوں۔ تم امیر کبیر لوگ ہو، میں تمہارے گھر نہیں رہ سکتی۔ مَیں تو پاگل ہوگئی تھی ....

"اس داستان کو سن کر آپ کیا کریں گی کہ شہزاد کے ساتھ میری شادی کس طرح ہوئی۔ بڑی مشکل سے شادی ہوئی۔ ماں باپ کے ہاں میرا آنا جانا بند ہو گیا مگر میں بہت خوش ہوں۔ شہزاد بڑی اچھی ملازمت کر رہا ہے۔ دو بچے ہیں۔ ہم کسی پہلو امیر کہلانے کے قابل نہیں لیکن میرے گھر میں وہی سکون اور اطمینان ہے جو میرے ماں باپ کے گھر اس وقت ہوا کرتا تھا جب ہم رَدّی والے کہلاتے تھے اور گوشت مہینے میں ایک بار پکا کرتا تھا۔"
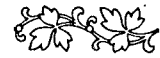
شریفوں کے محلّے میں

چال چلن کے لحاظ سے وہ عورت ٹھیک نہیں تھی، یا کم از کم اس کے متعلق یہی مشہور تھا کہ چلتی پھرتی عورت ہے اور اپنے بھلے مانس خاوند کی آنکھوں میں دُھول جھونک رہی ہے۔ مجھے تجسّس یُوں ہُوا کہ اپنے دُور پار کے رشتہ داروں کے گھر جانے کا اتفاق ہُوا۔ میزبان خاتون نے جنہیں میں خالہ کہا کرتی ہوں، اپنی ایک ہمسائی کے متعلق کہا — "سمجھ نہیں آتی یہ عورت ہے کیا۔ بڑی اچھی عورت ہے لیکن .... لیکن .... کچھ سمجھ نہیں آتی کہ اسے اچھا کہیں، بُرا کہیں، کیا کہیں۔"

خالہ نے رُک رُک کر دو مرتبہ "لیکن" کہا تو میرے کان کھڑے ہُوئے۔ میں چونکہ نفسیات کی طالبہ ہُوں اس لئے میں وثوق سے کہتی ہوں کہ اس قسم کی "لیکن" کے آگے ایک نفسیاتی کہانی ہوتی ہے جسے عام لوگ سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ یہاں سے انسانوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کو بدنام کرتے ہیں۔ میں آپ کو کہانی سناتی ہُوں آپ اس کا نفسیاتی پس منظر خود ہی سمجھ جائیں گے۔ میں نے خالہ سے کہا کہ وہ اس عورت کے متعلق مجھے پوری بات سنائیں۔ انہوں نے جو بات سنائی وہ یُوں ہے:

ہمارے ہاں ایک تو تنگ گلیوں والے پُرانے محلّے ہیں اور ایک کوٹھیوں کی آبادیاں ہیں۔ ان کے درمیان ایک اور کالونی ہوتی ہے جو تنگ گلیوں والے پُرانے محلّوں جیسی نہیں ہوتی اور وہاں کوٹھیاں بھی نہیں

ہوتیں۔ اس درمیانہ کالونی کی گلیاں فراخ اور مکان نئی طرز کے ہوتے ہیں۔ میری خالہ ایسی ہی ایک کالونی میں رہتی ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ تین ساڑھے تین سال گزرے، ان کی گلی میں جو اتنی فراخ ہے کہ دو کاریں پہلو بہ پہلو آسانی سے گزر سکتی ہیں، ایک مکان خالی ہُوا اور نئے کرایہ دار آئے۔ وہ تین افراد تھے — خاوند، بیوی اور ان کا ایک بچہ جس کی عمر آٹھ نو سال تھی۔

جب کسی محلے میں نئے کرایہ دار جاتے ہیں تو محلّے والوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا استقبال نہیں کرتے۔ ان سے شاید ہی کوئی بھلا آدمی جا کے پوچھتا ہو کہ وہ ابھی ابھی آتے ہیں، ان کے ساتھ بچے بھی ہیں، کیا ان کا فوری طور پر کھانے پینے کا انتظام ہے یا نہیں یا انہیں کسی تعاون یا مدد کی ضرورت ہو گی۔ اس کی بجائے محلّے کی عورتیں نئے کرایہ داروں کو نظروں سے ناپتی تولتی ہیں اور شام تک ان کے متعلق غیر مصدقہ خبر پھیل جاتی ہے کہ یہ لوگ کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کیسے ہیں۔ اگلے روز ان کے ساتھ ایک من گھڑت قِصّہ بھی منسوب کر دیا جاتا ہے۔

یہ عورت جب اپنے خاوند اور بچّے کے ساتھ میری خالہ کے محلّے میں خالی مکان میں آئی تو عورتوں نے اپنے اپنے دروازوں میں کھڑے ہو کر اُسے ٹرک سے سامان اُتروا تے دیکھا۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ اُس کے نقش تیکھے تھے۔ اُس نے گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ اُس کی چال میں پھُرتی تھی۔ وہ ٹرک کے ساتھ آتے ہوتے مزدوروں پر حکم چلا رہی تھی اور اُس کا خاوند خاموشی سے سامان اندر رکھوا رہا تھا۔ خاوند عمر کے لحاظ سے اس عورت سے خاصا بڑا لگتا تھا اور اُس میں پھُرتی نہیں تھی۔ میں نے اس عورت کو دیکھا ہے اور اس کے پاس بیٹھی بھی ہُوں۔ اس میں ایسی کشش ہے جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور راہ جاتے مرد رُک کر دیکھتے ہیں۔

خالہ کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ بولی "یہ تو کوئی ناچنے

گانے والی لگتی ہے۔"

اس عورت کا اصل نام کچھ اور ہے۔ آپ اسے مسرّت کہہ لیں۔ خالہ نے بتایا کہ مسرّت نے محلّے کی کسی بھی عورت سے نہ ملنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ پہلے پہل وہ باہر نکلی۔ اُس کے مکان کے باہر چھوٹا سا لان تھا۔ اس کے اردگرد اُونچی فصیل اور اس میں لوہے کا گیٹ تھا۔ مسرّت چند بار اس گیٹ میں کھڑی نظر آئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ بعض عورتیں کہتی تھیں کہ وہ انہیں دیکھ کر مُسکرائی بھی تھی مگر کسی عورت نے مُسکراہٹ کا جواب مُسکراہٹ سے نہ دیا اور کوئی عورت اُس کے قریب نہ گئی۔

عورتیں گھر گھر کام کرنے والی جمعدارنیوں اور ماسیوں سے دوسروں کے گھروں کے حالات معلوم کیا کرتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتیں کہ یہی ماسیاں اور جمعدارنیاں ان کے گھروں کی بھی باتیں مرچ مصالحہ لگا کر دوسری عورتوں کو سنایا کرتی ہیں مگر دوسروں کی آنکھ میں باریک سا تنکا دیکھ لینے والوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آیا کرتا۔ یہ اُس گھٹن کا نتیجہ ہے جو ہمارے گھروں میں پائی جاتی ہے۔ عورتیں ایک دوسری کے خلاف قِصّے کہانیاں گھڑ کر یا گھڑی ہوئی کہانیاں سُن کر دِلی مسرّت محسوس کرتی ہیں۔

عورتوں نے مسرّت کے متعلّق بھی اپنی جمعدارنیوں اور ماسیوں سے معلومات حاصل کرنی شروع کر دیں۔ ان کام کرنے والی عورتوں نے محلّے کی عورتوں کو بتایا کہ مسرّت شو باز (نمائش پسند) عورت ہے۔ اپنے خاوند کے ساتھ وہ خوش نہیں اور بنی ٹھنی رہتی ہے۔ اس رپورٹ پر عورتوں نے مسرّت کے خلاف فتویٰ دے دیا کہ بدکار عورت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا خاوند ایک تو عمر میں اس سے خاصا بڑا ہے دوسرے وہ سنجیدہ اور چُپ چاپ سا آدمی ہے۔

ایک روز محلّے میں مسرّت کی بد چلنی کی شہادت پہنچ گئی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ عینی شاہد کون تھا۔ آناً فاناً محلّے میں پھیل گئی کہ مسرّت کو ایک آدمی کے ساتھ کار میں کہیں جاتے دیکھا گیا ہے۔ وہ کار والے کے ساتھ ہنستی جا رہی تھی۔ دن گزرتے گئے اور کار میں مسرّت کے کسی کے ساتھ

جانے کی خبریں اضافے ہوتے گئے اور تان اس پر ٹوٹی ـــ "اس عورت کی دوستی تین چار کاروں والوں کے ساتھ ہے اور وہ کبھی نہ کسی کی کار میں کہیں نہ کہیں کار میں جاتی رہتی ہے۔"

خالہ نے بتایا کہ کار والوں کی دوستی کی خبر دو مردوں نے دی تھی۔ خالہ نے مجھے ان دونوں آدمیوں کے نام اور گھر بتائے اور خالہ نے بھی اس خبر کو سچ کہا اور رائے دی کہ یہ بدچلن عورت ہے اور اپنے خاوند کو دھوکہ دے رہی ہے۔

پھر مسرت کی بدچلنی کی ایک اور شہادت مل گئی جو عورتوں نے اپنی آنکھوں دیکھی۔ مسرت کا خاوند سکوٹر پہ دفتر چلا جاتا اور وہ بچے کو بھی ساتھ ہی اُس کے سکول لے جایا کرتا تھا۔ گھر میں مسرت اکیلی رہتی تھی۔ ایک آدمی کو دیکھا گیا جو تیسرے چوتھے روز اُس وقت مسرت کے گھر آتا تھا جس وقت وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ یہ آدمی ہر بار گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اندر رہتا اور چلا جاتا۔

میں نے خالہ سے پُوچھا کہ کسی نے یہ بھی کبھی معلوم کیا ہے کہ یہ آدمی مسرت کا بھائی تو نہیں؟

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" ـــ خالہ نے کہا ـــ "اس عورت کے متعلق یقین ہو چکا ہے کہ عصمت فروش ہے یا محض عیاشی کی خاطر بدچلن ہے۔ یہ کسی پہلو اچھی عورت نہیں۔"

خالہ نے جب یہ باتیں مجھے سُنائیں، اس سے دو ماہ بعد مجھے ایک بار پھر خالہ کے گھر جانے کا اتفاق ہُوا۔ میں مسرت کو بھول چکی تھی۔ چار دیواری کی دُنیا میں اس قسم کی سکینڈل بازی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ میرے لئے نہ مسرت اہم تھی نہ محلّے کی عورتوں کی باتیں۔ میں نے خالہ سے مسرت کا ذکر تک نہ کیا۔ خالہ نے خود ہی بات چھیڑ دی۔

"کچھ سمجھ نہیں آتی یہ عورت ہے کیا" ـــ خالہ نے کہا ـــ "اسے اچھا کہیں، بُرا کہیں، کیا کہیں۔"

اُس وقت تک مسرت کو اس محلّے میں آئے ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔

خالہ کی باتوں سے پتہ چلا کہ اس عرصے میں مسرت کی بدچلنی کی کئی اور شہادتیں ملیں اور سارے محلّے نے اُسے اچھوت قرار دے دیا۔ کوئی عورت اُس کے گھر اور وہ کسی کے گھر نہیں جاتی تھی۔ عورتیں کہتی تھیں ـــ "شریفوں کے محلّے میں کیسی بدچلن عورت آگئی ہے۔ یہ تو سارے محلّے کی رُسوائی ہے" ـــ اس کے خاوند کے ساتھ بھی محلّے کے مرد کم ہی بولتے تھے۔ وہ خاموش سا انسان ہے۔ اب بھی وہ محلّے والوں کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔

اس کا ایک بچّہ ہے۔ بچے اپنے والدین کے دشمنوں کے ساتھ بھی کھیلا کرتے ہیں۔ بچوّں میں دوستی اور دشمنی کا تصوّر کچھ اور ہوتا ہے۔ مسرت کا بچہ بھی محلّے کے بچوّں کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا مگر ماؤں نے اپنے بچوّں کو اُس کے ساتھ کھیلنے سے منع کر رکھا تھا۔ مسرت نے اپنے بچّے کے کھیلنے کا انتظام اپنے مکان کے چھوٹے سے لان میں کر رکھا تھا۔ ایک جھُولا لگا دیا تھا اور اس کے پاس چھوٹا سا ایک سائیکل تھا جو وہ گلی میں اور لان میں چلاتا تھا تو محلّے کے بچے اُسے ترسی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کوئی بچہ اُس کے قریب چلا جاتا تو ماں اُسے یُوں آواز دے کر اُس سے ہٹاتی تھی جیسے وہ غلاظت سے کھیل رہا ہو۔

پھر ایک روز طوفان آگیا۔ شام سے گھٹائیں اِدھر اُدھر سے اکٹھی ہو رہی تھیں۔ رات نو بجے کے لگ بھگ تیز آندھی کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ بڑا ہی خوفناک طوفان تھا۔ شہر میں درختوں کے ٹہن ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ خالہ کی ایک بچّی ہے جو اُس وقت دو اڑھائی سال کی تھی۔ اُس رات میرے خالو گھر نہیں تھے۔ کسی عزیز کی وفات پر گوجرانوالہ چلے گئے تھے۔ گھر میں خالہ اپنی بچّی کے ساتھ اکیلی تھی۔ اچانک بچّی کے مُنہ سے عجیب سی آواز نکلی اور اُسے تشنج کا دورہ پڑ گیا۔ بچّی کا رنگ نیلا ہو گیا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور ہاتھ پاؤں مُڑ گئے۔ بچّی کو ایسا حملہ پہلی بار ہُوا تھا۔ خالہ کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ ان کی گھبراہٹ اس وجہ سے بہت زیادہ ہوگئی کہ باہر آندھی اور بارش کا طوفان تھا۔ کسی ڈاکٹر کو بلا لانا ممکن نہیں تھا۔

جب بچّی کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی تو اُس کا چہرہ ڈراؤنا ہو گیا۔ خالہ کی چیخ نکل گئی اور وہ اپنے ایک پڑوسی کے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ آندھی اور طوفان کی تُندی سے اُس کے پاؤں اُکھڑ رہے تھے۔ اُس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا۔ اس پڑوسی کا گھر چند قدم دُور تھا لیکن طوفان نے چند میل بنا دیا۔ خالہ نے اندازے سے ایک دروازے پر بڑے زور سے دستک دی۔ دروازہ کُھلا تو اُس کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی ـــ دروازہ مسّرت نے کھولا تھا۔ خالہ کا اندازہ غلط نکلا۔ اُس نے غلطی سے مسّرت کا جا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اُس کے مُنہ سے "اوہ" نکل گئی۔

مسّرت نے اُس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ خالہ رو رہی تھی۔ مسّرت نے اُسے بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا اور پوچھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ خالہ اُس کے ساتھ بات کرنے سے جھجک رہی تھی لیکن وہ بچّی کو گھر میں اکیلی چھوڑ آئی تھی اور بچّی کی حالت بڑی ہی خوفناک تھی۔ خالہ بے اختیار ہو کے رونے لگی اور اُس نے مسّرت کو بچّی کی حالت بتا دی۔ مسّرت دوڑی اندر گئی اور ایک دو منٹ بعد دوڑی آئی۔ خالہ نے اُس کے مُنہ سے صرف یہ سُنا "جلدی آؤ" اور مسّرت طوفان میں نکل گئی۔

خالہ اُسے اپنے گھر لے گئی تو بچّی کی حالت وہی تھی۔ مسّرت کوئی دوائی ساتھ لائی تھی۔ اُس نے چھوٹی سی ایک شیشی کھول کر بچّی کی ناک کے ساتھ لگا دی۔ چند سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ بچّی کا اکڑا ہُوا اور لرزتا ہُوا جسم ساکن ہو گیا۔ مسّرت نے شیشی ہٹا لی اور بچّی کے پاؤں دبانے لگی، پھر اُس نے بچّی کو اُلٹا کر کے سر کے پیچھے کی رگیں انگوٹھوں سے مَلیں۔ بچّی کے رونے کی آواز آئی۔ مسّرت نے بچّی کو سیدھا کیا تو بچّی کی آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف تھا۔ خالہ نے بچّی کو گود میں لے لیا۔ مسّرت نے ایک گولی نکالی اور خالہ سے کہا کہ اسے رگڑ کر ایک گھونٹ پانی میں گھول لاؤ۔

مسّرت جب چمچ سے بچّی کے مُنہ میں دوائی ڈال رہی تھی تو خالہ

نے دیکھا کہ مسّرت کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے۔ تیز بارش نے اس کا میک اپ دھو ڈالا تھا۔ خالہ کہتی ہیں کہ اُس کا قدرتی رنگ انہیں بہت ہی پیارا لگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے خالہ کی بچّی کی جان بچائی اور اسے تشنج کے دورے سے نجات دلا دی تھی۔

"میری بچّی ایسے ہی دَورے سے مر گئی تھی" ـ مسّرت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ـ "اُس کی عمر اتنی ہی تھی۔ اُس رات میں بھی اکیلی تھی۔ ڈاکٹر تک پہنچتے بچّی مر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے یہ دوائی اور مالش کا یہ طریقہ بتایا تھا جو میری بچّی کے کام نہ آ سکا۔ تین سال گزر گئے ہیں۔ ایک بار ایسے ہی ایک پڑوسن کی بچّی کو دورہ پڑا تو میں وہاں موجود تھی۔ میں نے یہ دوائی منگواتی۔ بچّی کی ناک سے لگاتی اور اسی طرح بچّی کی مالش کی تو اُس کا دَورہ ختم ہو گیا۔ اُس وقت سے یہ دوائی میرے اٹیچی کیس میں رکھی ہے۔"

"لیکن یہ دَورہ پڑا کیوں؟" ـ خالہ نے پوچھا۔

"بچّی کو غالباً ہلکا ہلکا بخار تھا جس کا آپ کو پتہ نہ چلا اور بچّی نے بھی محسوس نہ کیا" ـ مسّرت نے کہا ـ "بخار اچانک تیز ہو گیا اور سر کو چڑھ گیا تھا۔ اب ایسے نہیں ہو گا۔ میں نے پانی میں جو گولی گھول کر دی ہے، اس سے پسینہ آئے گا اور بخار اُتر جائے گا۔ صبح اسے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جانا.... تمہارے میاں کہاں ہیں؟"

"گوجرانوالہ گئے ہیں" ـ خالہ نے جواب دیا ـ "کل شام واپس آئیں گے۔"

"پھر میں رات تمہارے پاس رہوں گی" ـ مسّرت نے کہا ـ "تم بہت ڈری ہوئی ہو۔ بچّی کو بھی دیکھتی رہوں گی۔ کہیں پھر گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میں خاوند سے کہہ آئی ہوں کہ مجھے رات یہیں گزارنی پڑی تو صبح واپس آؤں گی۔"

خالہ کو اُس وقت کسی کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ وہ واقعی ڈری ہوئی تھیں لیکن مسّرت جیسی بدنام عورت کو اپنے گھر رکھنے سے جھینپ رہی

تھیں۔ اُنھوں نے مسرت سے کہا کہ انہیں ساتھ کی ضرورت نہیں اور وہ مسرت کو اتنی زحمت نہیں دینا چاہتیں۔

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ تمہیں کسی کے ساتھ کی ضرورت ہے"— مسرت نے کہا—"ضروری نہیں کہ میں ہی تمہارے پاس رہوں۔ کسی اور پڑوسن کو بلا لو۔ جب تک وہ نہ آئے گی میں نہیں جاؤں گی۔"

خالہ اپنی جھینپ کو چھپا نہ سکیں مگر مسرت وہیں رہنے پر مُصر تھی۔ خالہ سیدھی خاتون ہیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا—"مجھے تمہارے ہی ساتھ کی ضرورت ہے، لیکن ..." اس سے آگے خالہ کچھ کہہ نہ سکی۔

"لیکن یہ کہ میں ناچنے گانے والی بدکار عورت ہوں"— مسرت نے مسکرا کر کہا—"اور اگر میں یہاں رہی تو محلے والے تمہیں بھی بدنام کر دیں گے .... میری بہن! میں ناچنے گانے والی نہیں اور نہ میں بدکار بھی نہیں۔ میں صرف بدنام ہوں، اور میں اس بدنامی کے خلاف کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں، اور افسوس اس لئے نہیں کہ مجھے بدنام کرنے والیوں اور ان کے خاوندوں کو بھی میں جانتی ہوں۔ میں یہاں کی جوان لڑکیوں کو بھی جانتی ہوں جن کی عشق بازیاں چھتوں پر فصیل کی اوٹ سے اشاروں سے چلتی ہیں۔ میں سب کے خاوندوں کی اور اس محلے کے نوجوان بیٹوں کی نظریں پہچانتی ہوں جن سے وہ مجھے دیکھتے ہیں، اور ان بھوکی نظروں سے وہ مجھے اس لئے دیکھتے ہیں کہ میں ایک بوڑھے خاوند کی جوان بیوی ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں خاوند سے نفرت کرتی ہوں گی اور میں اپنے جیسے کسی جوان آدمی کے ساتھ دوستی لگانا چاہتی ہوں گی۔ میں ان سب کو مایوس کر رہی ہوں۔ میں نظروں ہی نظروں میں ان سب پر لعنت بھیجتی ہوں۔ اس قسم کے مرد عورت کی اس قسم کی نظروں کو جن میں لعنت ہوتی ہے، اچھی طرح سمجھتے ہیں۔"

خالہ اس سے پوچھنا چاہتی تھیں کہ اس کے خاوند اور بیٹے کی غیر حاضری میں اس کے گھر جو آدمی آتا ہے وہ کون ہے اور کاروں والے اس کے کیا

لگتے ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھی جاتی ہے، مگر خالہ پر اس عورت کا ایسا جادو سوار ہو گیا تھا کہ انہیں اس سے کوئی ایسی ویسی بات پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

"اگر میں اس گلی کے تمام مردوں اور عورتوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے اس محلے کی دونوں جمعدارنیوں اور کام کرنے والی تین مائیوں کو کھڑا کر دوں تو سب بھاگ جائیں گے"— مسرت نے خالہ سے کہا—"تم لوگ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ کام کرنے والی جن عورتوں سے دوسرے گھروں کی جاسوسی کراتی ہو، وہی عورتیں تمہارے گھروں کے بھید دوسرے گھروں میں جا سناتی ہیں۔ کہو تو میں اس گلی کے ہر گھر کی ایک ایک بات سُنا دوں، لیکن میری جمعدارنی اور ایک کپڑے دھونے والی اور دوسری برتن جھاڑو والی مائی تمہیں میرے گھر کی کوئی بات نہیں سناتے گی۔ میں انہیں اُس سے دُگنی تنخواہ دیتی ہوں جو انہیں تمہارے گھروں سے ملتی ہے۔ میں انہیں دوپہر کا کھانا بھی کھلاتی ہوں۔ دونوں مائیوں کے تین بچوں کی سکول کی فیسیں بھی میں ادا کر رہی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرے گھر کی کوئی بات کسی کو نہ بتائیں بلکہ اس لئے کہ وہ غریب ہیں۔ اُن کے بچوں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر باوقار انسان بنیں اور جب ان کی شادیاں ہوں تو اُن کی بیویاں لوگوں کے گھروں کے برتن نہ مانجھیں"— اور بولتے بولتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

خالہ نے مجھے بتایا کہ اُس کے انداز میں بناوٹ اور ایکٹنگ نہیں تھی۔ اُس کے آنسوؤں نے خالہ پر ایسا اثر کیا کہ خالہ بے ساختہ بول اُٹھیں—"مسرت بہن! میں بھی انہی میں سے ہوں جو تمہیں بدنام کرتی ہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔ تم تو فرشتہ ہو۔"

"مجھے تمہاری یہ بات پسند نہیں آئی"— مسرت نے کہا—"تم مجھے اس لئے فرشتہ کہہ رہی ہو کہ میں نے تمہاری بچی کی جان بچائی ہے۔ جان بچانے والا خُدا ہے۔ اُس سے معافی مانگو۔ اگر میں تمہاری مدد کو نہ آتی تو میں تمہاری

نظروں میں طوائف ہی رہتی .... میرے متعلق گھر گھر میں جو باتیں ہوتی ہیں وہ مجھے جمعدارنی اور اپنی دونوں ماسیوں سے معلوم ہوتی رہتی ہیں ۔ اب تم مجھ سے پوچھو گی کہ وہ کون ہے جو میرے خاوند اور میرے بیٹے کی غیر حاضری میں میرے گھر آتا ہے، اور وہ کون ہے جس کے ساتھ میں کار میں جا رہی تھی تو میں اس کا جواب نہیں دوں گی کیونکہ تم سمجھ نہیں سکو گی، یا کل پرسوں جب تمہاری بچی ہنسنے کھیلنے لگے گی تو تم بھول جاؤ گی کہ کسی نے تمہاری بچی کو دورے سے نکالا تھا، پھر تم گلی کی عورتوں کو میری بدکاری کے قصے سنانے لگو گی۔"

اُس نے خالہ کو شرمسار کر دیا اور وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی، پھر کہنے لگی — "تم پہلے ہی پریشان ہو اور میں نے اپنی بک بک لگا رکھی ہے۔ جانے دو ان باتوں کو۔ سب سے کہنا کہ مجھے بدکار کہتی رہیں۔ میں تمہاری مدد کو اس لئے دوڑی نہیں آئی کہ تم مجھے نیک عورت کہو۔ یہ میرا فرض تھا، اور میں چند اور جگہوں پر بھی ایسا ہی فرض ادا کر رہی ہوں۔ اس سے میری روح کو تسکین ملتی ہے۔ تم سب میرے جسم کی باتیں کرتی ہو... کرتی رہو لیکن اس وقت تمہیں میرے ساتھ کی ضرورت ہے۔ میں رات تمہارے پاس گزاروں گی۔"

خالہ کی بچی سو گئی تھی۔ اُسے بخار تھا اور پسینہ آنے لگا تھا۔ خالہ کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ مسرت سے کہتی کہ وہ چلی جاتے۔ مسرت نے رات وہیں گزاری۔ اُس نے اپنے متعلق اور کوئی بات نہ کی محلے کی عورتوں کی کوئی بات نہ کی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ خالہ اور وہ آدھی رات کے بہت بعد سوئیں۔ مسرت صبح اپنے گھر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا خاوند خالہ کے گھر آیا اور کہنے لگا کہ وہ نو بجے کے بعد بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔

وہ خالہ اور بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے بھی گیا اور گلی کے گھر گھر میں کھُسر پھُسر شروع ہو گئی۔ خالہ نے سب کو بتایا کہ اس کی بچی کو مسرت نے نئی زندگی

دی ہے۔ اُس روز کے بعد خالہ نے مسرت کے حق میں پروپیگنڈہ کرتے رہنے کو جیسے اپنا مشن بنا لیا ہو۔ خالہ نے مسرت کے گھر جانا شروع کر دیا۔ عورتیں دُور سے مسرت کو بدنام کرتی رہتی تھیں۔ انہیں مسرت کو قریب سے دیکھنے کا یقیناً شوق تھا۔ خالہ نے پہل کی تو دوسری عورتیں بھی مسرت کے گھر جانے لگیں اور مسرت ان کے گھروں میں جانے لگی۔ بچے مسرت کے بچے کے ساتھ کھیلنے لگے۔ ان عورتوں کے ساتھ مسرت کا سلوک ایسا تھا کہ تمام عورتیں اس کی گرویدہ ہو گئیں۔

یہ عورت میری دلچسپی کا موضوع تھی کیونکہ یہ مجھے نفسیاتی کیس نظر آ رہی تھی۔ ایک روز میں خالہ کے ہاں گئی تو مسرت کے گھر چلی گئی۔ میں نے اُسے کسی کوشش کے بغیر بے تکلف ہو جانے والی عورت پایا۔ وہ شاید میرے انداز سے متاثر ہوئی یا شاید میری ڈگری اور میرے مضمون (نفسیات) سے متاثر ہوئی۔ اُس نے بلاجھجک وہ باتیں شروع کر دیں جو میں اُس کے مُنہ سے سُننا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے لئے سہولت پیدا کر دی۔ میں نے اُس سے بہت کچھ پُوچھا اور اُس نے مجھے سب کچھ بتایا۔

"اب وہ آدمی میرے پاس نہیں آتا جو میرے خاوند اور بیٹے کی غیر حاضری میں آیا کرتا تھا" — اُس نے بہت سی باتیں سنا کر کہا — "میں نے اُسے صاف کہہ دیا تھا کہ یہاں نہ آیا کرے"

"کیا یہ در پردہ محبت کا سلسلہ تھا؟" — میں نے ہنستے ہوئے اُسے چھیڑنے کے انداز سے کہا — "کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔"

وہ بھی ہنس پڑی اور بولی — "ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی لیکن اچانک ایسے ہُوا جیسے یہ آدمی مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

میں اُس کی باتیں اور اُس کی کہانی اختصار سے پیش کرتی ہوں۔ اُس کی ماں کی شادی پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور جب مسرت پیدا ہوئی تو اُس کی ماں کی عمر سولہ سال تھی۔ اُس کا باپ اُس کی ماں سے دس گیارہ سال بڑا تھا۔ مسرت کے بعد اُس کی ماں نے ایک بھی بچے کو جنم نہ

دیا۔ اُس کی ماں ابھی کمسن تھی کہ ماں بن گئی۔ یہ تو لڑکپن کے دن تھے۔ مسرت کا باپ رنگین مزاج آدمی تھا۔ مسرت نے مجھے بتایا —"میری ماں اور میرا باپ فلمی ہیروئن اور ہیرو کی طرح رہتے تھے۔ ماں ہر وقت میک اپ میں رہتی اور باپ اُس کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔"

بچی کی طرف ان کی اتنی توجہ نہیں ہوتی تھی جتنی ایک بچے کو ملنی چاہیئے۔ مسرت جب سمجھنے کی عمر میں داخل ہوتی تو بھی اس کے ماں باپ کے انداز نہ بدلے۔ ایک تو بچی توجہ اور پیار کو ترسنے لگی، دوسرے اُس نے یہ تاثر لیا کہ مرد کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ماں کی طرح بن ٹھن کے رہنا اور رومانی حرکتیں کرتے رہنا ضروری ہے۔ مسرت کو معلوم نہیں کہ اُس کی ماں نے کسی اور بچے کو کیوں جنم نہ دیا۔ اُسے شک ہے کہ اُس کے ماں باپ نے کوئی احتیاطی ذریعہ اختیار کر رکھا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی ماں سدا جوان رہنا چاہتی تھی۔ اُس عورت میں سنجیدگی نام کو نہیں تھی۔

مسرت کو سکول میں داخل کیا گیا لیکن پڑھنے میں اُسے دلچسپی نہیں تھی۔ بچپن سے اسے میک اپ کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ توجہ اور پیار کی محرومی سے دوچار ہوتی چلی گئی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی داستان سُنا رہی تھی اور میں اُس کا نفسیاتی تجزیہ کرتی جا رہی تھی۔ وہ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ میک اپ اور رومانی ایکٹنگ کو سمجھتی تھی۔

وہ جب دسویں جماعت میں پہنچی تو اس کی عمر سولہ سال ہو چکی تھی۔ وہ بہت خوبصورت نکلی مگر اندر سے وہ کھوکھلی تھی۔ وہ نمائش پسند ہو چکی تھی اور اپنے آپ کو نمائش کی چیز بنائے رکھتی تھی۔ اُس کی ماں جب کہ اُس کی بیٹی سولہ سال کی ہو چکی تھی، اپنے آپ کو سولہ سال کی لڑکی سمجھ رہی تھی۔ بیٹی پر اس کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ مسرت نے اپنے آپ کو نمائش کی چیز بنائے رکھا۔ سکول میں اس کی استانیوں اور ہیڈ مسٹریس نے بھی اُسے میک اپ سے منع کیا لیکن وہ میک اپ کرتی ہی رہی مگر

نمائش پسند ہونے کے باوجود اُس نے اپنا چال چلن بے داغ رکھا۔

"کیا نوجوان اور کیا اُن کے باپ" — مسرت نے کہا —"مجھے رُک کر دیکھا کرتے تھے اور نوجوان قریب سے گزرتے کچھ نہ کچھ بک جاتے تھے۔ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا تھا اور مجھے لطف آتا تھا۔" اُس نے کسی نوجوان کا پیغامِ محبت قبول نہ کیا، بلکہ بعض کو نفرت سے دھتکارا بھی۔ پڑھائی سے اس کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ آخر اُسے یہ خاوند مل گیا جو عمر میں اس سے پندرہ سال بڑا تھا۔ وہ اُس کے باپ کا گہرا دوست تھا۔ مسرت کو یہ آدمی بہت اچھا لگا۔ میں نے مسرت سے کرید کرید کر پوچھا کہ اُسے اس آدمی میں کیا کشش نظر آتی تھی۔ وہ اس کے سوا کوئی جواب نہ دے سکی کہ یہ آدمی اسے بہت اچھا لگا۔ وہ اسے توجہ دیتا تھا۔

یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ لڑکا ماں کی طرف اور لڑکی باپ کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مسرت کو اپنے باپ کی مُشفقانہ توجہ نہیں ملی تھی۔ وہ اس کی ماں میں مگن رہتا تھا۔ مسرت کو اس آدمی سے جو بعد میں اُس کا خاوند بنا مُشفقانہ توجہ مل گئی جو پیار کی صورت اختیار کر گئی۔ لاشعور کا فیصلہ تھا جو مسرت نے کیا اور ماں باپ نے اُسے اس آدمی سے بیاہ دیا۔ اس آدمی کی پہلے ایک بیوی تھی مگر ان میں ناچاقی تھی۔ اُس نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی۔ شادی کے بعد خاوند نے مسرت سے کہا کہ وہ میک اپ کسی خاص موقعے یا تقریب پر کیا کرے اور اُس نے مسرت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ خدا نے اُسے قدرتی رنگ اتنا پُرکشش دیا ہے کہ اُسے میک اپ کی ضرورت ہی نہیں لیکن مسرت نے ہر وقت میک اپ کئے رکھنے کی عادت نہ چھوڑی۔ شادی کر کے وہ اس لئے بھی خوش تھی کہ سکول سے نجات ملی۔

مسرت میں گھریلو عورتوں یا سُگھڑ بیویوں والے اوصاف پیدا نہ ہو سکے۔ گھر کے کام کاج میں وہ کوری تھی اور سنجیدہ محفل میں ایک باوقار بیوی کی طرح بات نہیں کر سکتی تھی۔ خاوند اسے آداب اور بات چیت کرنے کا

ڈھنگ سکھاتا تھا جسے اس کا ذہن قبول نہیں کرتا تھا۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا، مسرّت میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی تھی اور خاوند اُس سے مایوس ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اُس کا بچّہ پیدا ہُوا۔ اُس نے اپنی ماں کی طرح بچّے کو پوری توجّہ نہ دی۔ خاوند پہلے ہی اس سے مایوس ہو چکا تھا، اب وہ اور زیادہ مایوس ہُوا۔ پھر ایک بچّی پیدا ہوئی مگر مر گئی۔ میاں بیوی میں ناچاقی نہ ہُوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے رہے لیکن مسرّت محسوس کرنے لگی کہ خاوند اسے اب پہلے کی طرح وارفتگی سے نہیں چاہتا۔

بچّہ جب تین چار سال کا ہُوا تو باپ نے اُسے باہر لے جانا، سیر سپاٹا کرانا اور اُس کے ساتھ بچّوں کی طرح کھیلنا شروع کر دیا۔ اس سلوک سے بچّہ باپ کے ساتھ چپک گیا۔ ماں کی طرف وہ جیسے دیکھتا ہی نہیں تھا۔ پھر مسرّت کی ماں مر گئی اور پھر اُس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ مسرّت کا اپنا کوئی بھی نہ رہا۔ خاوند اور اُس کے بچّے نے بھی اس میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ مسرّت کو ماں کی موت کا ایسا صدمہ ہُوا کہ وہ ڈوبنے لگی۔

اس میں شفقت اور پیار کی تشنگی پیدا ہو گئی۔ اس کی جڑ بچپن میں تھی۔ اُسے نہ ماں کی پُوری توجّہ ملی تھی نہ باپ کی۔ اب خاوند بھی اور بچّہ بھی اس کے قریب ہوتے ہوتے اُس سے دُور ہٹ گئے اور ماں بھی مر گئی۔ اُس کے باپ نے اُس پر یہ کرم کیا کہ اُس کی ماں کے مرنے بعد اُس نے بائیس ہزار روپیہ مسرّت کو دیا۔ اُس نے یہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں رکھ لی۔

ایک روز اُس نے اپنے گھر میں کام کرنے والی مائی کو تنخواہ کے علاوہ دس روپے انعام یا خیرات کے طور پر دیئے۔ وہ عورت تو جیسے مسرّت کی زرخرید غلام بن گئی۔ اُس کے ساتھ ماؤں والا پیار کرنے لگی۔ مسرّت نے اُسے ہر ماہ دس روپے زیادہ دینے شروع کر دیئے۔ یہاں اُسے خیال آیا کہ خیرات بڑے کام کی چیز ہے۔ وہ جسے خیرات یا کارِ ثواب کہہ رہی تھی، وہ نفسیات کے علم کی روشنی میں دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ توجّہ اور پیار اور

اہمیت خرید رہی تھی۔

اُس نے ایک بڑی ہی غریب بیوہ کی بچّی کو اپنے خرچ پر سکول داخل کرا دیا اور ہر ماہ اُس کی فیس دینے لگی۔ اب وہ تین غریب بچّوں کی فیسیں دے رہی تھی۔ اپنے گھر کام کرنے والی دونوں مائیوں کو اور جمعدارنی کو وہ عام ریٹ سے زیادہ تنخواہ دے رہی تھی۔ یہ تمام عورتیں اُسے ماؤں کی طرح چاہتیں اور اُسے پیار کرتی تھیں۔

"مگر ایک ایسی تشنگی تھی جو مجھے بہت پریشان کرتی رہی"۔ اُس نے کہا ۔"میں اس محلّے میں آئی تو مجھے کام کرنے والی دو مائیاں مل گئیں۔ انہوں نے اور جمعدارنی نے مجھے بتایا کہ محلّے کی عورتیں مجھے عیاش اور بدکار کہتی ہیں۔ یہ تو میں خود بھی دیکھ رہی تھی کہ عورتیں مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ میرے بچّے کے ساتھ اپنے بچّوں کو کھیلنے نہیں دیتی تھیں۔ اپنا خاوند تو پہلے ہی مجھ سے روٹھا روٹھا رہنے لگا تھا۔ اس دوران خاوند نے اس آدمی کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ یہ میرے خاوند کا دوست ہے۔ اُس نے مجھ میں وہ دلچسپی لینی شروع کر دی جس کی میں تشنگی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے میرے خاوند اور بچّے کی غیر حاضری میں میرے ہاں آنا شروع کر دیا۔ وہ اتنی پیاری باتیں کرتا تھا کہ میری روح کی پیاس بجھ جاتی تھی مگر اُس کی نیّت بُری تھی۔ مجھے اُس کی ایسی نیّت کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ خاوند کے ہوتے ہوئے مجھے کسی غیر مرد کی ایسی ضرورت نہیں تھی کہ میں اُس کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے اُس کے صرف ساتھ کی ضرورت ہے۔ اُس نے میری یہ خواہش تسلیم تو کر لی لیکن اُس کی آنکھوں میں اُس کی نیّت جھلکتی نظر آتی رہی"۔

"اور وہ کار والا کون تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں اُس کے گھر تک لے جا سکتی ہُوں"۔۔۔ مسرّت نے جواب دیا۔۔۔"خود ہی دیکھ لینا وہ کون ہے۔ اُس نے اور اُس کی بیوی نے نادار اور بے سہارا لڑکیوں کی بہبود کے لئے ایک ادارہ کھول رکھا ہے۔ ان کے پاس بہت پیسہ ہے۔ دونوں بوڑھے ہیں۔ چلتی کار میں شاید وہ آدمی پیدل

چلتے لوگوں کو حیران نظر آتا ہو۔ کسی نے مجھے اس عظیم شخص کے متعلق بتایا تھا۔ میں اُس کے گھر گئی تھی اور وہ مجھے اپنی کار میں وہاں لے گیا تھا جہاں غریب بچیوں کو دستکاری وغیرہ سکھائی جاتی ہے لیکن یہاں محلے میں یہ مشہور کردیا گیا کہ میری دوستی تین چار کار والوں کے ساتھ ہے۔ میں صرف ایک بار کار میں گئی تھی، اور ادارہ دیکھا۔ میں چونکہ اس ادارے کے لئے کچھ نہیں کرسکتی تھی اس لئے پھر کبھی نہ گئی۔ میں اپنے ابّا جان کے دیئے ہوئے بیس ہزار روپے میں سے چودہ ہزار روپے تقسیم کرچکی ہوں۔ چھ ہزار روپیہ ابھی غریبوں کے لئے امانت پڑا ہے۔ میرا خاوند اچھا آدمی ہے۔ اس کی تنخواہ میں سے بھی کچھ رقم حاجت مند بچیوں کو دے دیتی ہوں۔"

وہ اس طرح مجھے اپنی روئیداد سُنا رہی تھی جیسے کوئی عورت پڑوسن کو بتا رہی ہو کہ آج اُس نے کیا پکایا ہے اور کس طرح پکایا ہے۔ مسرّت کے لہجے اور انداز میں ڈھینگ مارنے کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ شاید ہم سب پر طنز بھی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔

"اور بارش والی رات تمہاری خالہ نے غلطی سے میرا دروازہ آن کھٹکھٹایا" — مسرّت نے کہا — "مجھے دیکھ کر وہ اس طرح حیران اور پریشان ہو گئی جیسے کسی زاہد اور پارسا کے سامنے شیطان آن کھڑا ہُوا ہو۔ اُس پر اپنی بچی کی مصیبت آ پڑی تھی، پھر بھی وہ میرے ساتھ بات کرنے سے گریز کررہی تھی۔ وہ اگر مصیبت میں مبتلا نہ ہوتی اور اگر میں اُسے جذباتی سہارا نہ دیتی تو وہ واپس چلی جاتی۔"

اُس نے مجھے وہ سارا واقعہ سنایا جو مجھے اپنی خالہ سنا چکی تھی کہ کس طرح مسرّت نے ان کی بچی کو دَورے سے نجات دلائی تھی۔

"تمہاری خالہ پہلی عورت تھی جو میرے گھر آئی" — مسرّت نے کہا — "اور اس کے بعد دوسری عورتیں بھی آنے لگیں۔ وہ مجھے یُوں دیکھتی تھیں جیسے چڑیا گھر میں آسٹریلیا کے کنگرو کو دیکھ رہی ہوں جس کی اگلی ٹانگیں بہت چھوٹی

اور پچھلی بہت بڑی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنے متعلق جو باتیں تمہیں سنائی ہیں وہ انہیں نہیں سناؤں گی۔ میرے سلوک سے ہی سب مجھے پسند کرنے لگی ہیں تمہاری خالہ اور میری ایک ہم عمر عورت میری سہیلیاں بن گئی ہیں۔ اب مجھے کسی اور کے ساتھ کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے اپنے خاوند کے دوست کو صاف کہہ دیا ہے کہ وہ میرے گھر نہ آیا کرے۔ وہ اب نہیں آتا۔"

اُس نے کوئی ایک بھی بات شکایت یا پروپیگنڈے کے لہجے میں نہ کی۔ کہنے لگی — "اگر میں محلے کی ایک عورت کی مدد کو نہ پہنچتی تو میں اچھوت اور بدنام ہی رہتی۔ میں حیران ہوں کہ یہ عورتیں اس طرح کا رویّہ کیوں اختیار کرلیتی ہیں شاید لوگ اپنے عیب چھپانے کے لئے دوسروں کے خلاف قصے گھڑ لیتے ہیں۔ میں اس پر بھی حیران ہوں کہ بدنام مجھ جیسی ہوتی ہیں۔ صرف تم ہو جسے میں اس گلی کے صرف ایک گھر کی بات بتاتی ہوں۔ گلی کے آخر میں ایک گھر ہے جو شریفوں کا گھر مشہور ہے۔ باپ واقعی شریف آدمی ہے لیکن اس کی ایک جوان بیٹی کی در پردہ ملاقاتیں اسی گلی کے ایک گھر کے ایک شادی شُدہ آدمی کے ساتھ ہیں۔ ان کی پیغام رسانی کا ذریعہ میری ایک ماسی ہے، لیکن بدکار میں ہوں۔ اب یہ عورتیں میرے پاس آ بیٹھتی ہیں اور دوسروں کے گھروں کے قصے سناتی ہیں لیکن میں اس پر خوش ہوں کہ میرے گھر آتی تو ہیں۔"

رُوح کا روگ

میں نے جب اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ مجھے عام گھریلو عورتوں کی طرح ایک عورت دکھائی دی۔ کالا برقعہ، پاؤں میں چپل، عام گھریلو عورتوں کی طرح اُس نے میک اپ کر رکھا تھا۔ جب سے وہ میرے پاس بیٹھی تھی، اُس کے انداز میں شرمساری کی سی کیفیت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو۔ وہ اِدھر اُدھر یوں تجسس اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جیسے اس گھر میں پہلی مرتبہ آئی ہو حالانکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ پہلے بھی یہاں آ چکی ہے۔ وہ مجھ سے نظریں ملانے سے دانستہ گریز کر رہی تھی۔ سر جھکا کر بات کرتی تھی یا اِدھر اُدھر دیکھ کر میری بات کا سرسری جواب دیتی تھی۔ اُس کا رنگ گورا اور عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہو گی لیکن اپنی عمر سے پانچ چھ برس کم نظر آتی تھی۔ میں اُسے دلچسپی سے دیکھتی رہی اور اُس کی ایک ایک حرکت کو ذہن میں محفوظ کرنا شروع کر دیا۔

"جب اتنے بڑے ڈاکٹر میری تکلیف کو نہیں سمجھ سکے تو آپ میرا کیا علاج کریں گی"۔۔۔ اُس نے جب میرے ساتھ باتیں کرنی شروع کیں تو اُس نے کہا۔۔۔ "آپ تو معلوم ہوتا ہے نئی نئی ڈاکٹری پاس کر کے آئی ہیں"۔

میں اُس کی بات سمجھ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اُسے یقین دلاؤں کہ میں اُس کی بات سن کر اُس کی تکلیف سمجھ سکتی ہوں۔ میں نے اُسے مایوس نہیں کیا۔۔۔ "پہلے آپ برقعہ اتار کر میرے پاس آرام سے بیٹھیں۔ میں نے ڈاکٹری بے شک نئی نئی پاس کی ہے لیکن عورت ہونے کی وجہ سے میں آپ کی تکلیف کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہوں"۔

اُس نے جب برقعہ اُتارا تو میں اُس کی تکلیف کی وجہ کو تھوڑا سمجھ

گئی۔ برقعے کے نیچے اُس نے جس تراش خراش کا لباس پہن رکھا تھا اُسے
نیم عُریانی کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ باریک کپڑے کی قمیض اور آدھے
بازو جس سے اُس کے گورے بازو اور کندھے نظر آرہے تھے۔ ضرورت
سے زیادہ نیچا گریبان دیکھ کر میں نے اُس کی ساری نفسیاتی کمزوریاں بھانپ
لیں۔ پہلی نظر میں مجھے اُس کی شخصیت شوباز نظر آئی جسے نفسیات کی زبان
میں EXHIBITIONIST PERSONALITY کہتے ہیں۔

میں ڈاکٹر نہیں، نفسیات کی ایم۔ اے ہوں اور پڑھائی سے فراغت
کے بعد لائبریری کی موٹی موٹی کتابوں کی بجائے چار دیواری کی زندہ
گوشت پوست کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ جو علم مجھے چار دیواری کی دُنیا میں آکر
حاصل ہُوا ہے ویسا علم کتابیں نہیں دے سکتیں۔ اس وقت میں لیڈی ڈاکٹر
کے روپ میں اس عورت کے سامنے اس لئے آئی تھی کہ مجھے اُس کا تفصیلی
تجزیہ کرنا تھا

میری بچپن کی ایک سہیلی اسی محلّے میں بیاہی ہُوئی تھی۔ ایک دفعہ
جب وہ میرے پاس ملنے کے لئے آئی تو اُس نے مجھ سے اس عورت کا تذکرہ
کیا۔ اس کا اصلی نام کچھ اور ہے لیکن اس کہانی میں میں اُس کا نام رشیدہ لکھوں
گی۔ رشیدہ کے بارے میں مجھے میری سہیلی نے بتایا کہ بہت بدنام عورت ہے
اور اُس نے کئی لوگوں سے یارانہ گانٹھ رکھا ہے۔ محلّے کے کسی بھی گھر میں اُسے
اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اُس کا خاوند اس سے کم از کم دس برس بڑا ہے اور اپنے
کام سے کام رکھتا ہے۔ محلّے میں اُس کی کسی کے ساتھ بھی سلام دعا نہیں۔
خاموش طبع آدمی ہے۔ رشیدہ کے چار بچّے ہیں اور سب سے بڑا لڑکا میٹرک
میں پڑھتا ہے۔

میری سہیلی ثریّا نے مجھے بتایا کہ محلّے میں ایک آدمی رہتا ہے۔ اُس کا
نام بھی میں فرضی لکھوں گی۔ آپ اُسے غفور کہہ لیں۔ غفور رشیدہ کے خاوند کا ہم عمر
ہے لیکن اُس سے بالکل مختلف۔ اُس کی بیوی دس بارہ سال پہلے مرگئی تھی۔
اس کے بعد اُس نے دوسری شادی نہیں کی۔ غفور محلّے میں بہت مقبول ہے

اور محلّے کے ہر بچّے کا چچا ماموں ہے۔ محلّے کی عورتیں اُس سے پردہ نہیں
کرتیں۔ وہ ہر گھر میں بلا روک ٹوک آتا جاتا ہے۔ کسی گھر کا مرد ڈیوٹی پر ہو تو
سودا سلف بھی لا دیتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی خوبی جس کی وجہ سے لوگ
اُسے پیار کرتے ہیں اُس کا شگفتہ مزاج ہے۔ وہ ہر وقت ہنستا رہتا ہے اور
اُس سے مل کر غمگین سے غمگین آدمی بھی خوش ہوجاتا ہے۔

ثریّا نے مجھے بتایا کہ غفور رشیدہ کے گھر میں بھی آتا جاتا ہے اور بڑی
دیر تک اندر رہتا ہے۔ محلّے میں مشہور ہے کہ رشیدہ نے غفور کو بھی اپنا خاوند
بنا رکھا ہے۔ یہ بات سارے محلّے میں عام ہے لیکن وہ اتنا ہر دلعزیز ہے کہ
کوئی اُس پر اُنگلی نہیں اُٹھاتا۔ البتہ رشیدہ کو اس وجہ سے کوئی بھی اچھی نظر سے
نہیں دیکھتا کہ اُس نے غفور جیسے بھلے آدمی کو اپنے جال میں پھانس رکھا ہے۔

غفور کے علاوہ محلّے میں ایک ڈاکٹر بھی ہے۔ ڈاکٹر جوان عمر کا آدمی ہے
اور رشیدہ ہر روز اُس کے کلینک میں موجود ہوتی ہے۔ رشیدہ اس کے پاس
ایک ہی تکلیف لے کر جاتی ہے کہ اُس کی چھاتی میں درد ہے۔ محلّے کی عورتوں
کو معلوم ہے کہ وہ ڈاکٹر کے پاس کئی کئی گھنٹے بیٹھی رہتی ہے۔ ڈاکٹر بھی ہنسنے
کھیلنے والا آدمی ہے اور رشیدہ سے مذاق بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ محلّے
کے نوجوانوں سے بھی رشیدہ خاصی بے تکلّف ہے۔ ہمسایوں کا کہنا ہے کہ وہ
کھیل ہی کھیل میں اور مذاق ہی مذاق میں لڑکوں سے بغلگیر ہونے کی کوشش
کرتی ہے۔ یہ سب لڑکے اُسے باجی کہتے ہیں۔

خشک، سڑی اور غیر رومانی خاوند، جوان بیوی، جوان ڈاکٹر اور ہنستا
مُسکراتا غفور بھائی۔ ثریّا کی زبان سے یہ ساری باتیں سُن کر مجھے رشیدہ کا کیس
دلچسپ نظر آیا۔ میں خوش ہوئی کہ تجزیے کے لئے ایک کیس ہاتھ آیا۔ میں
نے ثریّا سے کہا کہ میں اسے ملنا چاہتی ہوں۔ ثریّا نے مجھے مشورہ دیا کہ میں
اسے لیڈی ڈاکٹر کے روپ میں ملوں۔ ثریّا نے اگرچہ ایم۔ اے پاس نہیں کیا
لیکن ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔

رشیدہ سے ملنے سے پہلے میں نے اُس کے ڈاکٹر سے ملنا ضروری

سمجھا۔ کلینک کا وقت ختم ہو رہا تھا اور مریض جا چکے تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے اپنا تعارف کرایا تو اُس نے خوش دلی سے میرا خیر مقدم کیا اور میرا مقصد جان کر بڑی بے تکلفی سے اپنا خیال ظاہر کیا کہ رشیدہ کو کوئی جسمانی تکلیف نہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ رشیدہ خاص طور پر اصرار کرتی ہے کہ تکلیف کے مقام پر اُسے سٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھا جائے۔ ڈاکٹر یہ جانتے ہوئے بھی کہ مریضہ کے پھیپھڑے اور دل کی کیفیت نارمل ہے اور پٹھوں میں کھچاؤ کے بھی کوئی آثار نہیں، اس کی یہ خواہش پوری کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ رشیدہ اپنی تکلیف کے علاوہ بھی بعض اوقات غیر ضروری گفتگو کئے جاتی ہے اور ڈاکٹر اس سے ہنسی مذاق کرتا ہے تو وہ مطمئن ہو کر چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طبی معائنے کے دوران رشیدہ کبھی کبھی ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر بھی اپنے سینے پر رکھ لیتی ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے اس سے زیادہ کوئی تفصیل فراہم نہیں کی۔

میرے ذہن میں رشیدہ کا تصوّر ذرا مختلف تھا۔ ایک حسین ناگن کا تصوّر جو دوسرے مردوں کو اپنی خوبصورتی یا چلتر پن کے جال میں پھنساتی ہے لیکن جب میں نے اُسے ثریّا کے گھر میں دیکھا تو وہ مجھے عام گھریلو سی عورت دکھائی دی۔ ثریّا اور محلّے کی دوسری لڑکیاں اُسے یہ کہہ کر میرے پاس لاتی تھیں کہ ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔ ثریّا نے رشیدہ کے سامنے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ۔۔۔ "باجی رشیدہ ہماری محلّے دار ہیں اور ان کو سینے میں درد کی شکایت ہے۔ بہت علاج کرایا لیکن درد ٹھیک نہیں ہوا۔ آپ ذرا توجہ سے دیکھیں"۔ یہ کہہ کر ساری لڑکیاں ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئیں تو رشیدہ نے مجھے کہا ۔۔۔ "جب اتنے بڑے بڑے ڈاکٹر میری تکلیف کو نہیں سمجھ سکے تو آپ میرا کیا علاج کریں گی؟"

پہلے پہل تو رشیدہ نے مجھ سے سرسری گفتگو کی لیکن میں نے اُسے یقین دلایا کہ عورت ہونے کے ناطے مجھے اُس سے ہمدردی ہے اور عورت کا روگ کوئی عورت ہی سمجھ سکتی ہے تو وہ ذرا کھل کر باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے وہ اچانک کہنے لگی ۔۔۔ "ثریّا نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں محلّے کی بڑی بدنام

عورت ہوں؟"

"بتایا تھا" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ثریّا نے مجھے یہ بتایا تھا کہ رشیدہ ایک شریف عورت ہے لیکن بدنام ہے لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کیوں بدنام ہیں۔ میں تو آپ کے اس درد کی وجہ معلوم کرنا چاہتی ہوں جس کی وجہ سے آپ کو ایک ڈاکٹر کے پاس روزانہ جانا پڑتا ہے اور جس نے آپ کو محلّے میں بلاوجہ بدنام کر دیا ہے۔"

میں کلینکل سائیکالوجی کی زیادہ ماہر نہیں لیکن میں نے اپنے محدود علم اور مختصر تجربے کی مدد سے اس سے بڑی لمبی چوڑی گفتگو کی۔ آپ کو شاید اتنی طویل باتوں سے دلچسپی نہ ہو۔ مختصر یہ کہ میں نے علم نفسیات کا جادو چلا کر اُسے رام کر لیا۔ اُس نے مجھے ڈاکٹر سمجھنا چھوڑ دیا۔ اس کی بجائے وہ مجھے اپنی ہمراز اور ہم خیال سہیلی سمجھنے لگی۔

اُس نے اپنا خاندانی پس منظر تفصیل سے سنایا۔ اُس کے پیدا ہونے پر اُس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ نے چند برس تو محبت سے اس کی پرورش کی لیکن بالآخر دوسری بیوی گھر میں لے آیا۔ پہلے سکول سے آ کر رشیدہ اپنے باپ سے بے تکلفی سے ہنستی بولتی تھی، اپنی استانیوں اور سکول کی سہیلیوں کے بارے میں ایک ایک بات اپنے باپ سے بیان کرتی تھی لیکن دوسری ماں کے آنے کے بعد باپ کے پاس بیٹی کی باتیں سننے کے لئے وقت ہی نہ رہا اور اسے ساتویں جماعت سے اُٹھا کر گھر کے کام کاج اور سوتیلی ماں کی خدمت پر لگا دیا گیا۔ اُس کا بہت جی چاہتا تھا کہ اپنے باپ سے اُسی طرح بیٹھ کر باتیں کیا کرے لیکن اس کا باپ تو دوسری بیوی کی باتیں سنا کرتا تھا۔

تھوڑے ہی عرصے بعد اُس کا سوتیلا بھائی پیدا ہوا تو اُس کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا لیکن یہ مصروفیت اُسے خوشگوار محسوس ہوتی کیونکہ وہ اُس شیر خوار بچے سے اپنے دل کی ساری باتیں کہہ دیا کرتی تھی، چاہے وہ کچھ بھی نہ سمجھے اور جواب میں پیاری پیاری قلقاریاں بھرتا رہے۔ چند سال بعد سوتیلی ماں نے طلاق لے لی اور اپنے بچے کو اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ رشیدہ کا

ننھا مُنا ساتھی بھی اس سے کھو گیا۔ باپ نے نوجوانی کے آغاز میں ہی رشیدہ کی شادی کر دی اور خود ملنگ بن کر مزاروں کا ہو رہا۔ رشیدہ کی بدقسمتی سے اُس کو شوہر بھی ایسا ملا جو مٹی کا مادھو تھا اور جس کا دِل لطیف جذبات سے خالی تھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد بھی رشیدہ کی زندگی بے رنگ ہی رہی۔

"عورت صرف بچے پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتی"۔۔۔ رشیدہ نے بڑے دُکھ سے کہا ۔۔۔ "وہ چاہتی ہے کہ اُس کا کوئی ساتھی ہو جس سے وہ ہنس بول لیا کرے اور جو اُس کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو۔ میرا بھی دل چاہتا تھا کہ جو باتیں میں بچپن سے اپنے سینے میں روک کر بیٹھی ہوں کسی کے سامنے کروں۔ اپنے سینے کا بُوجھ ہلکا کر لیا کروں لیکن میرے خاوند کو سوائے اپنے کام کاج کے اور کسی چیز سے ذرا دلچسپی نہیں۔ لوگ میرے میاں کو امیر آدمی سمجھتے ہیں لیکن اُس کی دولت سے مجھے کوئی سکون نہیں ملا۔ وہ مجھے صرف اس قابل سمجھتا ہے کہ میں اُس کے حیوانی جذبے کی تسکین کرتی رہوں اور اس کے بچے پیدا کرتی رہوں"۔

"کیا یہ ہر عورت کا مقدر ہے؟"۔۔۔ اُس نے مجھے تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا ۔۔۔ "مجھے بتاؤ نا راشدہ! زندگی صرف یہ تو نہیں ہے۔ مجھے ایک ہوس کار مرد نہیں ایک غمخوار ساتھی کی ضرورت ہے جو میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے پیار بھری باتیں کرے۔ اُس کی آنکھوں میں جنسی بھوک کی بجائے محبت ہو اور اُس کے ہاتھوں میں بجلی کا کرنٹ ہو کہ جب وہ مجھے ہاتھ لگاتے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ خوف سے نہیں بلکہ فرطِ جذبات سے ....

"لوگ مجھے ڈاکٹر کا نام لے کر بدنام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کوئی بُرا آدمی نہیں۔ وہ میری بات توجّہ سے سُنتا ہے۔ مجھ سے ہنسی مذاق بھی کرتا ہے۔ میری باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب بھی دیتا ہے اور اُس کے ہاتھوں میں بجلی کا کرنٹ بھی ہے۔ نہ وہ بدکار ہے نہ میں بدکار ہُوں۔ یہ خُدا جانتا ہے۔ وہ عظیم انسان ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ سمجھ گیا ہے کہ مجھے کوئی مرض نہیں لیکن اُسے معلوم ہے کہ میری روح بیمار ہے۔ وہ میرے سر پہ ہاتھ رکھتا

ہے، میری نبض پہ ہاتھ رکھتا ہے، میری سُنتا ہے، ہنستا ہے، ہنساتا ہے۔ اگر یہ بدکاری ہے تو میں بدکار ہُوں"۔

اس وقت تک میں رشیدہ کی مجبُوری جان چکی تھی لیکن مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ جس توجّہ کی اسے ضرورت ہے، وہ اسے ڈاکٹر سے مل جاتی ہے تو پھر اس نے غفور بھائی سے ناجائز تعلّقات کیوں قائم کر رکھے ہیں جب کہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑا ہے؟ اس دوران میری گفتگو کی وجہ سے وہ مجھ سے اتنی بے تکلّف ہو چکی تھی کہ اُس نے اپنی زبان سے اپنے تمام راز بے نقاب کر دیئے۔

"یہ غفور بھائی کا کیا چکّر ہے؟"۔۔۔ میں نے اُس سے پوچھا ۔۔۔ "اور لوگ اُس کے اور تمہارے بارے میں اتنی بیہودہ باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

اُس نے ایک لمحے کے لئے مجھے حیرت سے دیکھا جیسے اُسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہ ہو۔ پھر کہنے لگی ۔۔۔ "غفور بھائی کا سب گھروں میں آنا جانا ہے۔ کوئی عورت اس سے پردہ نہیں کرتی۔ سب اس سے ہنستی بولتی ہیں لیکن جب وہ میرے گھر میں آتا ہے تو میں بدنام ہو جاتی ہُوں"۔

مجھے اس جواب سے اطمینان نہ ہُوا۔ میرے دل میں یہ خیال موجود تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ غفور اتنا زندہ دل ہے جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا اور وہ اکیلا بھی ہے۔ تنہائی کی زندگی ہو اور ایک گھامڑ اور لاپرواہ شوہر کی بیوی بھی میسّر ہو جو لوگوں سے گرمجوشی کی طالب ہو تو کوئی اچھی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے اُسے مزید کریدا۔ اُس سے بظاہر غیر ضروری گفتگو بھی کی اور بالآخر اُسے جواب دینے پر مجبُور کر دیا لیکن اُس نے جو جواب مجھے دیا، اُس سے مجھے حیرت کا شدید دھچکا لگا۔

"غفور بھائی میرا باپ ہے"۔۔۔ رشیدہ نے بڑے اطمینان سے کہا ۔۔۔ "میرے اور اُس کے تعلّقات ناجائز ہو ہی نہیں سکتے۔ مجھے اُس کے رویّے میں اور اُس کی محبّت میں اپنے باپ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اپنی سہیلیوں کی اور اپنے شوہر کی اور اپنے محلّے کی وہ ساری باتیں جو میں اپنے باپ سے

نہیں کرسکی تھی، میں غفور بھائی سے کرتی ہوں۔ وہ میرا ساتھی بھی ہے۔ میرے پاس گھنٹوں بیٹھا میری باتیں سنتا رہتا ہے۔ اُس نے مجھے کبھی مَیلی نظر سے نہیں دیکھا۔ اُس کی بیوی مر چکی ہے۔ اُسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے اب تک شادی نہیں کی۔ ہم اتنی دیر تنہائی میں بیٹھتے ہیں، اُس نے کبھی مجھ سے غلط بات نہیں کی۔ میرے جسم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ہاں اگر کبھی میں رو پڑوں تو میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے تسلّی دیتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے غفور بھائی ہی میرا باپ ہے ....

"محلّے کے لڑکے جب میرے ساتھ کھیلتے ہیں تو مجھے اپنا سوتیلا بھائی یاد آتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے، ان لڑکوں کی عمر کا ہوگا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے بچھڑتے ہوئے بھائی کو گلے لگا لوں لیکن محلّے والوں سے ڈر لگتا ہے۔ اُنہوں نے اب اپنے لڑکوں کو میرے گھر آنے سے بھی روک دیا ہے....

"میری ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو راشدہ! میں یہ بات ہر کسی کو کس طرح سمجھاؤں .... بات یہ ہے کہ غیر مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات وہ عورتیں رکھتی ہیں جو جنسی بھوک سے مری جاتی ہیں۔ بعض کے خاوند اُن کی جنسی آسودگی کے قابل نہیں ہوتے اور بعض کے دماغوں پر جنس ہر وقت سوار رہتی ہے۔ حیوانوں کی طرح وہ پیٹ کی بھوک اور جنسی لذّت کی بھوک کے سوا اور کچھ محسوس نہیں کرتیں۔ یہ ایک نشہ ہے جسے وہ پورا کرتی رہتی ہیں ....

"مجھے تو جنسی جذبے سے نفرت ہوگئی ہے۔ میں تم پر اپنی شرافت کا رُعب نہیں جما رہی۔ میں جسم کی بات کر رہی ہوں۔ جنسی لذّت سے تو میں تنگ آ گئی ہوئی ہوں۔ میرا خاوند اس کام کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ میں بخار کی حالت میں بھی اُس کی حیوانیت سے محفوظ نہیں رہتی۔ میں رفیقۂ حیات نہیں بلکہ میں اپنے خاوند کی زر خرید لونڈی ہوں۔ دیکھ لو میں کتنے بچے جن چکی ہوں۔ میری جنسی بھوک مر چکی ہے۔ میں پیار کی پیاسی ہوں۔"

راشدہ جب مجھے اپنی داستان سنا چکی تو اُس نے مجھ سے اپنے سینے

کے درد کا کوئی تذکرہ نہ کیا اور مجھ سے دوائی پوچھے بغیر ہی چلی گئی۔ جاتے ہوئے کہنے لگی ـــ "تم مجھے بہت اچھی لگی ہو لیکن میں تمہیں اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دوں گی۔ کہیں میرے ساتھ تم بھی بدنام نہ ہو جاؤ۔"

کوئی ایک ماہ پہلے میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے کے لئے گئی جو ایک مقامی ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اُس کی ڈیوٹی زچہ بچہ وارڈ میں لگی ہوئی ہے۔ میں اس کے پاس بیٹھی تھی کہ آیا نے آکر اطلاع دی ـــ "چودہ نمبر والی کی لڑکی پیدا ہوئی ہے لیکن اُس کا شوہر نہ جانے کہاں ہے۔ بچی اور اُس کی ماں کے لئے کپڑے چاہئیں۔ کس سے کہوں؟"

لیڈی ڈاکٹر مجھے لیبر روم میں لے گئی۔ وہاں راشدہ اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت رہی تھی۔ اُس نے مجھے خالی خالی نگاہوں سے دیکھا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ اُس کے چہرے کا ویران سا تاثر جیسے کہہ رہا تھا ـــ "مجھے کوئی جسمانی تکلیف نہیں۔ خدا نے عورت کو بے پناہ قوّتِ برداشت دے کر بچے پیدا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ میرا جسم ٹھیک ہے روح بیمار ہے۔ اس روگ سے مجھے موت ہی نجات دلائے گی مگر روگ ختم نہیں ہوگا۔ میرے خاوند جیسے خاوند اس روگ کو زندہ رکھیں گے۔"

مائی مستانی

میری چچازاد بہن نے جب مجھے اس عورت کے بارے میں بتایا کہ وہ چور ہے اور اس کے تھیلے میں محلے کے ہر گھر کی کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی چیز موجود رہتی ہے جو اُس نے چرائی ہے تو میں حیران ہو گئی۔ میری حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ میری بہن کے بقول محلے کے سب لوگ اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ بوڑھی عورت چور ہے مگر سب اُس کے ساتھ اتنی محبت سے پیش آتے تھے جیسے وہ اُن کی سگی رشتہ دار ہو۔ میں نے غور سے اس عورت کو دیکھا عمر ساٹھ ستر کے درمیان تھی۔ اُس نے میلا کچیلا سفید رنگ کا برقعہ اوڑھ رکھا تھا جس میں سر کے مقام پر ٹوپی ہوتی ہے اور نقاب کی جگہ کپڑے کی جالی۔ یونیورسٹی کی بعض لڑکیاں ایسے برقعے کو شٹل کاک اور بعض سفید کفن کہا کرتی ہیں۔

اُس کا اصلی نام شاید کچھ اور تھا مگر سب اُسے مائی مستانی کہتے ہیں مجھے باوجود کوشش کے معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے اس کے انداز سے بظاہر مجذوبیت یا جنون کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی گفتگو اتنی شیریں اور لہجے دار تھی کہ منہ سے پھول جھڑنے کا محاورہ شاید اسی کے لئے وضع کیا گیا تھا۔

آپ شاید اس طرح کے کرداروں کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوں۔ عام زندگی کے ریلے میں اِدھر اُدھر لڑھکتے اور ٹھوکریں کھاتے یہ کردار شاید آپ کے لئے غیر دلچسپ ہوں لیکن چار دیواری کی دنیا کی ساری رونق ایسے ہی کرداروں کی بدولت ہے۔ میرے لئے اس طرح کے کرداروں کا مطالعہ

اس لئے بھی دلچسپی کا باعث ہے کہ میری تعلیم کا موضوع یہی کردار ہیں۔

میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں علمِ نفسیات کی طالبہ رہی ہوں انفرادی کردار جو نفسیات کی نظر میں ابنارمل ہوتے ہیں ہمیشہ سے میرا موضوع رہے ہیں۔

میرا نفسیات کا علم بہت مختصر ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس وجہ سے میرا نقطۂ نظر بھی محدود ہو لیکن جب بھی میں نے اپنے اس مختصر علم کے ذریعے معاشرے کا جائزہ لیا ہے میں سو میں سے بانوے معاملات کے سلسلے میں ایک ہی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ صرف ایک خطرناک بُرائی ہے جو ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے اور اقدار کے ڈھانچے کو دیمک کی طرح کھا رہی ہے ــــ وہ ہے جھوٹ۔

میری بہن نے جب مجھے بتایا کہ مائی مستانی معاشرے کے جھوٹ کی پیداوار ہے تو میں نے اس کے بارے میں کھوج لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ مائی مستانی سے براہِ راست تو اُس کے حالات دریافت کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ ابھی اس سے میری بے تکلفی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں ایم۔ اے کا امتحان دینے کے بعد اپنی چچازاد بہن کے سُسرالی قصبے میں چھٹیاں گزارنے آئی تھی۔ ابھی آئے دو ہی دن گزرے تھے اور مائی مستانی سے باقاعدہ تعارف بھی نہیں ہُوا تھا، پھر بھی میں نے محسوس کیا جیسے اس چھوٹے سے قصبے میں ہر شخص مائی مستانی کا شیدائی ہے۔

میری بہن نے مجھے مائی مستانی کی کہانی تفصیل سے سنائی تو میں نے سُن کر لکھ لی۔ اس کے بعد میں اس قصبے میں اور کہانیاں تلاش کرنے لگی۔ یہاں میرے قیام کے دوران ہی مائی مستانی سے میری بے تکلفی پیدا ہو گئی اور میں کئی بار اُس کے پاس بیٹھی۔ اُس سے باتیں کیں۔ کچھ اپنی سنائی کچھ اُس کی سُنی۔ اُس کی زبانی کہانی سُن کر پہلے سے لکھی ہوئی کہانی کو دوبارہ لکھنا پڑا اب جو کہانی میں آپ کو سنا رہی ہوں اس کا کچھ حصہ میری بہن کی روایت ہے اور کچھ حصہ میں نے براہِ راست مائی مستانی سے سُنا ہے۔

مائی کا حُلیہ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ اگر وہ اس حُلیے میں کسی بڑے شہر میں آ جاتی تو گلی محلوں کے بچے "پاگل ای اوئے پاگل ای اوئے" کے نعرے لگاتے اور اس کے پیچھے لگ جاتے۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چھوٹے سے ایک قصبے میں رہتی تھی جہاں کسی کی قدر و قیمت کا معیار اس کی ظاہری وضع قطع نہیں ہوتی۔

مائی کے بارے میں یہ بات میرے لئے بہت بڑا انکشاف تھی کہ وہ لوگوں کے گھروں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چُرا لیتی ہے۔ محلّے کی ساری عورتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تھیلے میں کسی کی سرخی، کسی کے باورچی خانے کی ماچس، کسی کا چمچہ اور کسی کی پلیٹ پڑی ہے۔ بہت سی عورتیں اُس کے گھر جا کر اپنی اپنی چیزیں دیکھ بھی آتی ہیں لیکن کسی نے بھی مائی مستانی سے بازپُرس کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ آنکھ بچا کر خود اعتمادی سے لوگوں کی چیزیں اپنے تھیلے میں ڈال لیتی ہے جیسے اپنی مستعار دی ہوئی چیزیں واپس لے رہی ہو۔ مسروقہ اشیاء سے بھرا ہُوا جو تھیلا وہ اٹھائے پھرتی ہے وہ بھی چوری کا ہے۔

مائی مستانی کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ شادی کے صرف تین ماہ بعد بیوہ ہو گئی تھی۔ مرحوم شوہر کی نشانی ایک بچہ تھا جو مُردہ پیدا ہُوا تھا۔ اُس نے اپنی جوانی ایک گاؤں میں گزاری اور خود کو اس طرح زمانے کی سرد و گرم ہواؤں سے بچاتی رہی جیسے کوئی نوزائیدہ بچے کو بچا کر رکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ گاؤں کے ایک صاحب کی وساطت سے جو قصبے میں ایک دکان پر منشی تھے، اس قصبے میں آ گئی اور یہاں ایک محلّے میں رہ کر لوگوں کے گھروں کے کام کاج کرنے لگی۔ وہ جوان تھی مگر اس نے دوسری شادی نہ کرنے کی قسم کھائی اور اس عمر کو آ لگی جہاں اس کے سر کا کوئی ایک آدھ ہی بال کالا رہ گیا ہو گا۔

اُس کا ہر کسی کے گھر میں آنا جانا ہے۔ گھر کی عورتیں یہ جانتے ہُوئے بھی کہ مائی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لے جاتی ہے، اُسے خوشی سے اپنے گھر میں آنے جانے دیتی ہیں۔ اُس کی گفتگو اتنی خوبصورت ہوتی ہے اور وہ محلّے بھر کی

باتیں اتنا نمک مرچ لگا کر بیان کرتی ہے کہ ہر عورت اسے اپنا دوست سمجھتی ہے اور یہ خیال نہیں کرتی کہ مائی اگلے گھر جا کر اُس کے متعلق بھی یہی باتیں کر رہی ہو گی۔

ایک دفعہ ایک عورت نے جو محلّے میں نئی نئی آئی تھی، مائی کے گھر میں جا کر اپنی مسروقہ اشیاء شناخت کر لیں اور مائی کو پکڑ لیا۔ اس عورت نے اتنا شور مچایا کہ سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔ باقی عورتوں کو جب یہ پتہ چلا کہ اس عورت نے مائی کو چوری کے الزام میں پکڑا ہے تو انہوں نے اُسے بُرا بھلا کہا اور مائی کی حمایت کی۔

ہماری چار دیواری کی دُنیا گُھٹن کی دُنیا ہے۔ اس دُنیا میں باہر کی روشنی اور تازہ ہوا نہیں پہنچ سکتی۔ یہاں رہنے والی عورتوں کو مناسب تفریح میسر نہیں۔ ایسے ماحول میں مائی کی ذات عورتوں کے لئے غنیمت ہے۔ وہ اس سے محلّے بھر کے سکینڈل مزے لے لے کر سُنتی ہیں۔ اس تفریح کے بدلے اگر مائی ان کی چھوٹی چھوٹی چیزیں اپنے تھیلے میں بھر لے تو ان کے لئے یہ سودا مہنگا نہیں۔

جب میری بہن نے مجھے بتایا کہ مائی پولیس کی مُخبر بھی رہی ہے تو میرے دل میں اس کے خلاف سخت گِھن پیدا ہوئی۔ ایسی عورتیں جرائم پیشہ ہوتی ہیں اور پولیس کی مددگار بھی۔ اس قسم کی عورتوں کے بارے میں جُرم و سزا کی کہانیوں میں اکثر تذکرہ ملتا ہے۔ مائی بھی مجھے ایسے ہی کرداروں میں سے ایک لگی۔

میری بہن نے مجھے مائی مستانی کے بارے میں ایک واقعہ سنایا۔ ایک دفعہ محلّے میں چوری ہو گئی۔ پولیس ایک شخص کو گرفتار کر کے لے گئی۔ چار روز بعد مائی پولیس کے پاس پہنچ گئی۔ اُس نے تھانیدار سے کہا کہ مُلزم کو چھوڑ دے، وہ بے گناہ ہے۔ تھانیدار نے اسے ہنس کر ٹال دینا چاہا تو اُس نے تھانیدار سے کہا کہ چوری کا مال فلاں گھر میں پڑا ہے، چل کر برآمد کر لو۔

چوری کا مال مائی مستانی کی نشاندہی پر برآمد ہو گیا۔ مائی کو ہر گھر کی خبر

رہتی ہے اس لئے اُس کو معلوم ہے کہ کس گھر کا مال کس گھر میں گیا ہے۔ وہ خود بھی چھوٹی چھوٹی چیزیں پار کرتی رہتی ہے لیکن ایک بے گناہ کو اُس نے چوری کے الزام سے بچا لیا۔ اس کے بعد اُس نے باقاعدہ پولیس کی مُخبری شروع کر دی۔

"میں کسی بے گناہ کو سزا ملتے نہیں دیکھ سکتی"۔ مائی مستانی نے مجھے اپنی کہانی سناتے ہوئے بتایا۔ اُس نے مجھے تفصیل سے اپنی زندگی کی کہانی سنائی اور اپنی ذات کے ایسے ایسے گوشے بے نقاب کئے جو اس سے پہلے کسی کے سامنے نہیں آتے تھے۔

مائی مستانی دُور دراز کے ایک گاؤں میں غریب کسانوں کی بیٹی تھی۔ اُس کے ماں باپ صبح و شام زمین کے مالکوں کے لئے کھیتی باڑی کر کے اناج اُگاتے اور خود بھوکے رہتے تھے۔ مائی مستانی کا ایک ہی بھائی تھا۔ وہ خود بھی ماں باپ کی اکیلی بیٹی تھی۔ ایک بھائی اور ایک بہن۔ اتنے مختصر سے کنبے کے باوجود مائی کے ماں باپ ان کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا نہیں کر سکتے تھے۔

مائی جب جوان ہوئی تو حسبِ روایت گاؤں کے آوارہ شہزادوں نے اسے اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ تو مائی نے نہیں بتایا کہ وہ جوانی میں کتنی کچھ خوبصورت ہوا کرتی تھی لیکن اس عمر میں بھی اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جوانی میں خاصی خوبصورت رہی ہو گی۔ چوہدریوں کے بیٹوں اور بھائیوں نے اسے نوٹ دکھانے شروع کر دیئے۔ بعض نے اسے راستے میں روک کر کپڑوں اور زیورات کا لالچ دیا لیکن مائی ان کی باتوں میں نہ آئی۔

مائی کے ماں باپ کو تو اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ گاؤں بھر کے امیر زادے ان کی بیٹی کے پیچھے شکاری کُتّوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ انہیں اگر یہ بات معلوم ہو جاتی تو بھی وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ بھائی ابھی چھوٹا تھا اس لئے مائی اسے بھی اعتماد میں نہیں لے سکتی تھی۔

ماتی کی خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی نزدیکی گاؤں سے اس کے لئے رشتہ آگیا۔ لڑکا کاشتکاری کرتا تھا۔ اُس کی تھوڑی سی اپنی زمین بھی تھی۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ ماتی کے ماں باپ کو یہ لڑکا پسند آگیا اور یوں ماتی کی شادی طے ہوگئی۔

گاؤں کے چوہدری کو ماتی کے جوان ہونے کا پتہ اُس وقت چلا جب ماتی کا باپ چوہدری سے بیٹی کے جہیز کے لئے قرض مانگنے گیا۔ چوہدری نے ماتی کی شادی کی خبر سُن کر یوں خوشی ظاہر کی جیسے اُس کی اپنی بیٹی کی شادی ہورہی ہو۔ اُس نے ماتی کے باپ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہا کہ ذرا اپنی بیٹی کو حویلی میں تو بھجوا دینا۔ چوہدرانی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ غریب کسان میں انکار یا لیت و لعل کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

شام کو جب ماتی حویلی میں چوہدرانی کی خدمت کے لئے گئی تو اُسے چوہدرانی کی بجائے چوہدری کے پاس بھیج دیا گیا۔ چوہدری کو دیکھ کر وہ ہچکچائی تو اُس نے شفقت سے کہا — "چل آ لڑکی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" ماتی اُس کے لہجے میں شفقت کا احساس کر کے اُس کے قریب چلی گئی۔ اُس نے ماتی سے پاؤں دبوائے اور کہا کہ تمہارا باپ تمہارے جہیز کے لئے رقم مانگنے آیا تھا۔ تھوڑی دیر پاؤں دابنے کے بعد چوہدری نے ماتی کو گھر جانے کی اجازت دے دی اور اگلے روز پھر آنے کو کہا۔

ماتی سمجھی کہ جہیز کے لئے قرضہ لینے کے عوض اتنی ذرا سی خدمت معمولی بات ہے۔ وہ اگلے روز خود بخود چلی گئی۔ اگلے روز بھی چوہدری نے اس سے پاؤں دبوانے کا کام لیا اور اس سے اس کی شادی کے متعلق باتیں کرتا رہا۔

تیسرے روز وہ جب چوہدری کے پاس گئی تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ چوہدری شراب کے نشے میں دُھت تھا اور اُس نے بوتل اور گلاس اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ماتی کو دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اُٹھا۔ ماتی گھبرا گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ خود بخود پیچھے سے بند

ہوگیا۔ اُس نے اس بار پاؤں دبوانے کی بجائے ماتی کو سامنے بٹھا لیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ باتیں کرتے کرتے اُس نے کہا — "مجھے معلوم نہیں تمہارا باپ تمہاری شادی ایک بھوکے ننگے سے کیوں کر رہا ہے؟" پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے ماتی کو پکڑ لیا اور کہنے لگا — "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں اپنی چوہدرانی بناؤں گا۔ تم جیسی خوبصورت لڑکی نے میرے دل پر جادو کر دیا ہے۔"

ماتی نے خود کو بڑی مشکل سے چوہدری سے چھڑایا اور بولی — "چوہدری صاحب! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ میں آپ کی بڑی بیٹی سے بھی چھوٹی ہوں۔"

اگر خدا کا خوف ہوتا تو چوہدری ایسی بات ہی کیوں کرتا۔ اُس نے ماتی کو پھر پکڑ لیا۔ دھینگا مشتی میں ماتی کے کپڑے تار تار ہوگئے۔

اچانک اُس کے ذہن میں ایک بات آئی اور اُس نے چوہدری سے کہا — "ذرا ٹھہر جائیں اور میری بات سُنیں۔" جب چوہدری نے اُسے چھوڑ دیا تو وہ بولی — "آپ کے ساتھ شادی کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" — چوہدری نے بیتابی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ آپ اپنی بڑی بیٹی کی شادی میرے باپ سے کر دیں۔ میں خوشی سے آپ کی بیوی بن جاؤں گی۔"

چوہدری کی چوہدراہٹ یہ بات برداشت نہ کر سکی۔ وہ پاگل ہوگیا۔ اُس نے شراب کے نشے میں ماتی کو خوب مارا اور پھر یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا — "میں دیکھتا ہوں تیرے ساتھ شادی کون کرتا ہے۔"

اُس نے اپنے ماں باپ کو یہ بات بتائی تو وہ لوگ ڈر گئے۔ اُس کے باپ نے چوہدری سے قرض لینے کا خیال بھی چھوڑ دیا۔ غریب کسان تھے۔ اپنے چوہدریوں کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ اُس کے باپ نے ہونے والے داماد کو بلا کر اُس سے کہا کہ وہ بیٹی کو جہیز کے بغیر ہی رخصت کر رہا ہے اور شادی بھی مقررہ تاریخ سے پہلے کرنی پڑے گی۔ داماد شریف آدمی تھا۔ اُس نے

چون وچرا نہ کی اور آخر ایک روز آکر مائی کو بیاہ کر لے گیا۔

مائی کے لئے وہ دن بڑی خوشی کا دن تھا۔ ایک اس لئے کہ اُسے اتنا خوبصورت اور جوان خاوند ملا تھا، دوسرا اس لئے کہ وہ چوہدری کے تسلّط سے نکل گئی تھی لیکن بار بار چوہدری کی یہ بات ــــ "میں دیکھتا ہوں تیرے ساتھ شادی کون کرتا ہے" اُس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح برستی تھی۔ اس کی چھٹی حس اُسے خبردار کر رہی تھی کہ چوہدری اُس کے خاوند کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اسی پریشانی میں پہلی رات گزر گئی اور وہ ٹھیک طرح سے اپنے خاوند کو دیکھ بھی نہ سکی۔ اُس کا دولہا اُس کی اس پریشانی کی وجہ ماں باپ سے دُوری سمجھتا رہا۔ اگلی تین راتیں بھی اسی طرح گزر گئیں۔ چوتھی رات کے بعد ابھی صبح بھی نہیں ہوئی تھی کہ سارا گاؤں ان کے گھر کے دروازے پر جمع ہو گیا۔ مائی کا خاوند حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہے۔ وہ باہر نکلا اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اُس کے دروازے پر ایک جوان آدمی کی لاش پڑی ہے۔ لاش کے آس پاس خون کا کوئی نشان تک نہیں تھا۔ لاش کی زبان اور آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔

مائی کے خاوند کے گھر کے باہر ان کی شادی کے چوتھے دن ایک جوان آدمی کی لاش دیکھ کر ان کے گاؤں والے بھی حیران تھے۔ مائی نے باہر نکل کر لاش کو دیکھا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔ مقتول اُس کے گاؤں کا ایک نوجوان تھا۔ کبڈی کا کھلاڑی تھا اور اس کی ذات بھی گاؤں کے ذات پات کے نظام میں کمترین سمجھی جاتی تھی لیکن اُسے یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ گاؤں کے اسی چوہدری کا، جس نے مائی کو شادی کے بغیر بیوی بنانے کی کوشش کی تھی، اپنا آدمی تھا اور اس کی حویلی میں ہی رہتا تھا۔

ابھی مائی، اُس کا خاوند اور گاؤں کے لوگ لاش دیکھ کر حیران ہو ہی رہے تھے کہ پولیس آ گئی۔ معلوم نہیں تھانے میں خبر کس نے کی تھی۔ تھانہ اس گاؤں سے پانچ کوس اور مائی کے گاؤں کے نزدیک ہی واقع تھا۔ پولیس والوں نے بھی حیرت انگیز پھرتی دکھائی تھی۔ پولیس کے ہمراہ وہی چوہدری

تھا۔ پولیس نے آتے ہی حیران و پریشان دولہا کو گرفتار کر لیا۔

مائی کے خاوند کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اُس کے خلاف پولیس میں رپورٹ چوہدری نے درج کرائی تھی۔ قتل کے محرکات میں یہ لکھوایا گیا تھا کہ مقتول کے مائی کے ساتھ شادی سے پہلے ناجائز تعلقات تھے۔ شادی ہو گئی تو وہ مائی سے ملنے کے لئے آیا۔ اِدھر مائی کو بھی اس کے آنے کے پروگرام کا علم تھا۔ مائی اپنے خاوند کو سوتا چھوڑ کر گھر کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ مقتول آیا تو مائی اسے بھوسے اور گھاس والے کمرے میں لے آئی اور دونوں راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔ اُدھر دولہا نے رات کو جاگ کر جب دیکھا کہ دلہن غائب ہے تو وہ دبے پاؤں اُس کی تلاش میں باہر نکلا۔ اُسے بھوسے کی کوٹھڑی سے آواز آئی۔ اُس نے جھانک کر غور سے دیکھا۔ اُس کی دلہن مقتول کی آغوش میں تھی۔ جوشِ انتقام سے وہ اندھا ہو گیا۔ اُس نے وہیں دروازے میں پڑی رسی اٹھائی اور مقتول کے گلے میں لپیٹ کر اچانک بل دے دیا۔ مقتول مزاحمت نہ کر سکا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

اس کہانی میں کئی سوال غور طلب تھے۔ مثلاً اگر قتل مائی کے خاوند نے ہی کیا تھا تو لاش اپنے دروازے میں کیوں رکھ دی؟ ویرانے میں کیوں نہ ڈال دی؟ پولیس کو اتنی جلدی اس قتل کی خبر کیسے ملی؟

مائی اپنی جگہ پر اور اس کا خاوند تھانے میں عجیب سی صورتِ حال میں گرفتار تھا۔ مائی نے اپنے گاؤں میں مقتول سے کبھی بات تک نہیں کی تھی۔ ناجائز تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مائی یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا خاوند ان چار راتوں میں اس کے ساتھ ہی رہا ہے۔ مائی سمجھ گئی کہ چوہدری نے اپنے آدمی کی قربانی دے کر اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔

پولیس کی تفتیش بھی عجیب تھی۔ مائی کو تھانے بلا کر بالکل برہنہ کر دیا گیا۔ چار سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ یہ منظر پیدا کر کے مائی کے خاوند سے اقبالی بیان لیا گیا کہ اُس نے واقعی مقتول کو رقابت میں قتل کیا ہے۔ پولیس

نے دو سال پہلے ہونے والی قتل کی ایک واردات بھی اس کے اقبالی بیان میں شامل کر لی۔ اُسے اُس کا اقبالی بیان رٹا دیا گیا اور دھمکی دی گئی کہ اگر اُس نے اپنے بیان سے منحرف ہونے کی کوشش کی تو اس کی بیوی کو ہر روز تھانے بلا کر بے آبرو کیا جاتا رہے گا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

پولیس نے آلۂ قتل یعنی رسّی بھی مائی کے گھر سے برآمد کر لی اگرچہ یہ رسّی مویشیوں کی کھُرلیوں پر کام آتی تھی۔ پولیس نے اپنے گواہ بھی پیدا کر لئے تھے۔ مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔

مقتول کے گاؤں کے امام مسجد نے عدالت میں حلف اٹھا کر جھوٹا بیان دیا کہ مقتول کو اُس نے ملزم کے گھر کے سامنے رات کو کھڑے دیکھا تھا۔ امام نے یہ بھی کہا کہ ملزم کی بیوی کو شادی سے پہلے تین چار مرتبہ مقتول کے ساتھ اکٹھے دیکھا تھا۔

ملزم کے گاؤں کے ایک حاجی صاحب نے عدالت میں حلف اُٹھا کر یہ بیان دیا — "میں اُس رات تہجد کی نماز کے لئے اٹھا۔ وضو کرنے کے لئے صحن میں گیا تو ملزم کے گھر سے عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ ملزم کا گھر میرے گھر سے قریب ہی ہے۔ میں نے قریب جا کر سننے کی کوشش کی تو ایسے لگا جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ ملزم کی گالیاں اور دلہن کی چیخیں بھی سنائی دیں۔"

انہی شہادتوں اور ایسے استغاثے کی بنیاد پر جس میں مائی کے خاوند کے دیرینہ ناکردہ گناہ بھی شامل تھے، بے گناہ ملزم کو پھانسی دے دی گئی۔ مائی شادی کے صرف تین ماہ بعد بیوہ ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد مائی کا مُردہ بچہ پیدا ہُوا اور مائی اپنے ماں باپ کے پاس آ گئی۔

"خاوند کے بغیر عورت کی کوئی زندگی نہیں" — مائی نے مجھے بتایا —
"خاوند نہ ہو تو لوگ بیوہ کو اپنی لونڈی سمجھ لیتے ہیں۔"

اپنی زندگی کے حقیقی افسانے کے اس موڑ پر آ کر مائی آبدیدہ ہو گئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے خاوند کے مقدمے کے لئے گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بیچ دی تھیں۔ پھر بھی وکیل کے لئے فیس پوری نہ ہو سکی۔ اُس نے محلے کے گھروں سے بھی چھوٹی موٹی چیزیں اُٹھا لیں لیکن وکیل کی فیس

اتنی زیادہ تھی کہ پوری ہی نہیں ہوتی تھی۔ وکیل نے اس سے کہا کہ فیس پوری نہیں ہوتی تو کوئی بات نہیں۔ اُس نے مائی کو اپنے گھر بلا لیا۔

وہ وکیل ہندو تھا اور اکیلا رہتا تھا۔ وکیل نے اُس سے اظہارِ افسوس کیا کہ اس کا محبوب قتل ہو گیا ہے اور اُس کا خاوند پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے۔ مائی نے قسمیں کھا کر اُسے یقین دلایا کہ مقتول کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"وہ تو جھوٹ کی دُنیا کا آدمی تھا" — مائی نے بتایا — "میری قسموں کو بھی جھوٹ سمجھا اور فیس کی بقایا رقم مجھ سے پوری کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے لیکن اُس نے پروا نہ کی۔ جس عزت کی حفاظت کے لئے میرے خاوند نے ناکردہ گناہ اپنے سر لے لئے تھے اور پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈال لیا تھا، وہ ایک وکیل کے گھر میں آ کر برباد ہو گئی ....

"عدالت میں وکیل نے میرے خاوند کو بری کرانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ وہ ہر پیشی پر مجھے اپنے گھر بلا لیتا تھا اور خوشخبری سناتا تھا کہ جج نے تمہارے خاوند کو بری کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں اس کے جھوٹ کو سچ سمجھتی رہی اور اپنے خاوند کی رہائی کے لئے اپنی عزت پیش کرتی رہی لیکن وکیل کی ساری باتیں جھوٹ نکلیں اور ایک بے گناہ آدمی پھانسی چڑھ گیا .... اُس دن کے بعد سے جب بھی کوئی بے گناہ آدمی گرفتار ہوتا ہے میرے دل پر جیسے میرے خاوند کی روح گھونسے مارتی ہے۔ میں اپنے طور پر ہر گھر میں جا کر جرم کا کھوج لگانے کی کوشش کرتی ہوں۔ جب مجھے جُرم کا سراغ مل جاتا ہے تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا اور پولیس کو جا کر میں ساری بات بتا دیتی ہوں۔ امام مسجد، حاجی صاحب اور وکیل کے جھوٹ نے مجھے اس حال میں پہنچایا ہے کہ میں جھوٹے الزام میں کسی کو پھنستے نہیں دیکھ سکتی۔ لوگ مجھے پولیس کی مُخبر کہتے ہیں۔"

امام مسجد اور حاجی صاحب کی زبان سے جھوٹ سُن کر مائی مستانی کی

عقیدت کو سخت دھچکا لگا تھا۔ اُس کے خیال میں ایسی برگزیدہ ہستیوں سے جھوٹ کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔ میری نفسیاتی تحقیق کہتی ہے کہ کسی آدمی کے تقدس کا معیار اُس کی ظاہری برگزیدگی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ایسے بہت سے کیس پڑھے ہیں۔ لوگ خود کو لوگوں سے بالا رکھنے کے لئے اور اپنی ذات کی نمائش کے لئے ظاہری عبادت کرتے ہیں اور اگر انہیں اپنی برتری کو برقرار رکھنے کے لئے جھوٹ بھی بولنا پڑے تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اپنی بات منوانے کے لئے وہ ہر قسم کی گھٹیا حرکت پر اُتر آتے تھے۔ اصل برگزیدگی وہی ہوتی ہے جس میں عبادت کے ساتھ انسان کے اخلاق و کردار سے لوگوں کو سُکھ پہنچے۔

جہاں تک مائی مستانی کی کہانی کا تعلق ہے وہ تو میں ایک آدھ دن میں لکھ سکتی تھی لیکن کہانی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ مائی مستانی نے بتایا کہ کچھ عرصے بعد امام مسجد جس نے جھوٹی گواہی دی تھی وہ پاگل ہو گیا تھا اور دوسرا جھوٹا گواہ حاجی صاحب، بڑی بُری موت مرا تھا۔ اُس کے دماغ پر بھی اثر ہو گیا تھا۔ میں چونکہ یہ واقعہ کہانی کی صورت میں نہیں بلکہ نفسیاتی کیس کی صورت میں سُنا رہی ہوں اس لئے میں نے امام اور حاجی کی ذہنی کیفیت کے متعلق تحقیق کرنا ضروری سمجھا۔

میں نے اپنے والد صاحب مرحوم کے ذرائع استعمال کئے۔ واقعہ پاکستان بننے سے پہلے کا تھا لیکن اس چوہدری کا گاؤں پاکستان میں ہی تھا۔ اس گاؤں میں اُس وقت کے لوگ موجود تھے۔ انہیں یہ واقعہ اس طرح یاد تھا جیسے دو تین مہینے پہلے کی بات ہو۔ مجھے جن معلومات کی ضرورت تھی وہ مل گئیں اور یہ کہانی یا یہ کیس مکمل ہو گیا۔

مذہب کی نگاہ سے دیکھا جاتے تو امام مسجد اور حاجی کے انجام کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے انہیں جھوٹ کی سزا دُنیا میں ہی دے دی۔ گاؤں کے دو بزرگوں نے میرے بھیجے ہوئے آدمیوں سے کہا تھا ۔۔۔ "گاؤں کے لوگ

جانتے تھے کہ مقتول کو اس لڑکی (مائی مستانی) کے خاوند نے قتل نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ چوہدری کی اپنی بیٹی جوان تھی۔ اُس کی شادی ہونے والی تھی۔ اُس نے مقتول کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ مقتول کی حیثیت ذات پات کے حساب سے چوہدری کے مقابلے میں نوکروں چاکروں والی تھی لیکن چوہدری کی بیٹی اُس پر مر مٹی تھی۔ اُس کی شادی کا دن مقرر ہو چکا تھا پھر بھی اُس نے مقتول کے ساتھ دوستی قائم رکھی ہوئی تھی....

"خدا نے چوہدری کو بے گناہ آدمی کو پھانسی چڑھوانے کی جو سزا دی تھی وہ ہر کسی نے دیکھی۔ اُس کی بیٹی کی شادی ہو گئی لیکن ایک سال بعد اُسے طلاق ہو گئی کیونکہ اتنے خوبصورت اور تندرست خاوند کے ہوتے ہوئے اُس نے ایک اور آدمی کو بھی اپنا خاوند بنا لیا تھا۔ وہ ماں باپ کے گھر بیٹھی تھی لیکن خوش تھی۔ اُس نے دو آدمیوں کے ساتھ یاری لگالی۔ ان میں ایک اُس کا نوکر تھا۔ اُس لڑکی کی حالت کُتیا جیسی تھی۔ وہ مرد کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ چوہدری نے اُسے مارا پیٹا۔ اُس کا رشتہ کوئی لیتا ہی نہیں تھا....

"آخر وہ ایک رات غائب ہو گئی۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ چوہدری نے بیٹی کو قتل کرا کے لاش غائب کر دی ہے اور کچھ لوگ کہتے تھے کہ لڑکی کسی شہری کے ساتھ چلی گئی ہے۔ چوہدری کی یہ حالت ہو گئی جیسے مر گیا ہو۔ جن لوگوں کو وہ گالی دے کر بلایا کرتا تھا، اُن کے ساتھ بھی وہ سر جھکا کر بات کرنے لگا۔ پھر حالت یہاں تک پہنچی کہ اُس کے نوکر چاکر اور مزارعے اُس پر حکم چلاتے تھے۔"

میں چونکہ نفسیاتی تجزیہ پیش کر رہی ہوں اس لئے میں نے واقعات کو اسی نظر سے دیکھا ہے۔ امام مسجد اور حاجی کا کیس ایک جیسا ہے۔ یہ دونوں ضمیر پر جُرم کے بوجھ GUILT FEELING کے شکار ہوئے۔ دونوں گناہوں کی دُنیا کے آدمی نہیں تھے۔ امام اپنے آپ کو لوگوں کا مذہبی پیشوا سمجھتا تھا اور یہ بھی کہ وہ عام لوگوں کی نسبت خدا کے زیادہ قریب ہے مگر دولت کے لالچ کو وہ دبا نہ سکا۔ اُس پر یہ خوف بھی طاری تھی کہ اُس نے

چوہدری کا کام نہ کیا تو چوہدری اُسے گاؤں سے نکلوا دے گا یا اُس کے خلاف کوئی اور کارروائی کرے گا۔ چنانچہ اُس نے عدالت میں اللہ کے نام کا حلف اُٹھا کر جھوٹا بیان دیا۔

جُرم کا بوجھ یعنی احساسِ جُرم بڑا ہی نامراد نفسیاتی نقص ہے۔ امام اور حاجی کو کون بتاتا کہ وہ اِس نقص کو قبول کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کریں جس کا طریقہ یہ تھا کہ خُدا کے حضور توبہ کرتے لیکن یہ اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اُنہوں نے ایک بیگناہ آدمی کو سزائے موت دلا دی تھی۔ یہ قتل تھا۔ انہوں نے دراصل ایک آدمی کو قانون کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا تھا۔

انسان کا خون کر دینا اتنا گھناؤنا اور ہولناک جُرم ہے جسے کم از کم امام اور حاجی جیسے لوگ ہضم نہیں کر سکتے اور اس کے ردِّعمل کو وہ برداشت نہیں کر سکتے۔

امام کا ردِّعمل یُوں شروع ہُوا کہ وہ صرف جھُوٹ کے موضوع پر وعظ سنانے لگا۔ لوگوں کو سناتا تھا کہ جھُوٹ بولنے والوں کو اگلے جہان کیسی کیسی سزائیں ملیں گی۔ وہ دراصل لاشعوری طور پر اپنے آپ کو یہ سزائیں دے رہا تھا۔ ایک مہینہ بعد اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ گاؤں کے کسی آدمی کو پکڑ لیتا اور اُسے کہتا کہ تم جھُوٹ بولتے ہو، پھر اُسے بتانے لگتا کہ جھُوٹ بولنے والے کو اگلے جہان دوزخ کے کون سے حصّے میں رکھا جائے گا۔

ڈیڑھ دو مہینے گزرے تو وہ گاؤں والوں کے گلے پڑنے لگا۔ ایک روز اُس نے اپنی بیوی کو اتنا مارا پیٹا کہ بیوی دو گھنٹے بیہوش پڑی رہی۔ اس سے اگلے روز امام مسجد نے پاگلوں کی سی حرکتیں شروع کر دیں اور اُس نے مسجد میں جانا چھوڑ دیا۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے اُسے باؤلے کُتّے نے کاٹ لیا ہو۔ وہ ہر کسی کو مارنے کو دوڑتا تھا۔ اُس کی بیوی اور دونوں بچّوں کو گاؤں کے ایک گھر میں چھپا دیا گیا کیونکہ وہ ان پر حملے کرتا تھا۔

اُس کی یہ حالت آٹھ دس دنوں میں بگڑ گئی اور وہ ایک روز غائب ہو گیا۔ حاجی صاحب میں یہ نفسیاتی خرابی پیدا ہُوئی کہ چُپ چاپ رہنے لگا اور

دن بدن کمزور ہوتا گیا۔ اُس کے گھر والوں نے ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج کرایا لیکن وہ چارپائی سے لگ گیا۔ اُس نے دوائی لینی چھوڑ دی۔ ایک روز اُس نے چیخنا شروع کر دیا۔ دوسرے روز اُس نے ماتی مستانی کے خاوند کا نام لے کر کہا — "اسے باہر نکالو۔ یہ میرا گلا گھونٹنے آیا ہے۔"

گھر والوں نے اُسے کہا کہ اُسے تو پھانسی ہو گئی ہے مگر حاجی چھ سات روز کہتا رہا کہ وہ میرا گلا گھونٹنے آیا ہے۔ یہ دَورے کی کیفیت تھی۔ ایک روز اسی دَورے میں وہ مر گیا۔

مُردہ بچّے کی پیدائش کے بعد مائی مستانی ماں باپ کے گھر آ گئی۔ سب لوگ اُسے مظلوم اور اس کے خاوند کو بے گناہ سمجھ رہے تھے۔ امام مسجد اور حاجی صاحب کا انجام دیکھ کر چوہدری کا دل کانپ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ مظلوم اور بے سہارا لڑکی کا نگہبان بھی کوئی ہے اور وہ سب سے بڑی طاقت ہے۔

ایک روز چوہدری ماتی کے گھر آ گیا اور اُس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اُس نے اُسے بیٹی کہا اور اُس سے معافی مانگی۔ اُس نے کہا — "بیٹی میں تمہارا گناہگار ہوں۔ میں تمہیں غریب اور بے سہارا لڑکی سمجھ رہا تھا۔ تمہارے جہیز کے لئے تمہارے باپ کو دی گئی قرضے کی رقم میں تم سے پوری کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بات بھول گیا تھا کہ میرے گھر میں اپنی جوان بیٹی بھی ہے۔"

چوہدری نے اب تک جو سزا پائی تھی، اس کی ساری تفصیل ماتی کو سنائی۔ مقتول کو چوہدری نے ہی قتل کرایا تھا لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ ماتی کے خاوند کو پھنسانا چاہتا تھا۔ مقتول کو چوہدری نے کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر قتل کرایا تھا۔ جب لاش ٹھکانے لگانے کا مسئلہ درپیش آیا تو اسے ماتی کے خاوند کا خیال آیا اور اُس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ لاش کو اُٹھا کر ماتی کے خاوند کے دروازے پر رکھ آؤ۔ خود وہ اُسی وقت تھانے روانہ ہو گیا۔ تھانیدار اُس کا اپنا آدمی تھا۔ اُس نے رپورٹ چوہدری کی مرضی کے مطابق درج کی اور لاش برآمد کرانے کے لئے فوراً ہی چل پڑا۔ تھانیدار کی طرح گواہ بھی چوہدری نے اپنی

دولت سے خریدے اور اپنے کندھے سے جُرم کا بوجھ ہٹانے کے لئے پھانسی کا پھندہ ایک بے گناہ کے گلے میں ڈال دیا۔

مائی کا خاوند اُس دَور میں بے گناہ پھانسی چڑھا تھا جب انگریزوں کی حکومت تھی۔ جنگِ عظیم دوم میں انگریزوں کا وطن برطانیہ تباہ و برباد ہو رہا تھا۔ انہیں ہندوستان سے فوجی بھرتی کی بھی ضرورت تھی اور جنگ کے لئے پیسے کی بھی۔ یہ دونوں چیزیں دیہات کے چوہدریوں کے ہاتھ میں تھیں۔ انگریز انہیں خوش رکھتے تھے اور یہ انگریزوں کو خوش رکھتے تھے۔ وہ جو چاہتے تھے کرا لیتے تھے۔

اس معاشرے میں مائی ایک جوان بیوہ تھی۔ اُس کے کہنے کے مطابق، کون تھا جس نے اُس پر بُری نظر نہ ڈالی ہو۔ یہ ایک اور داستان ہے کہ اُس نے اپنا دامن کس طرح بچائے رکھا۔ وہ پتھر بن گئی تھی۔ اُس کے سینے میں جیسے دل تھا ہی نہیں۔ وہ جان گئی کہ جس معاشرے کی بنیاد جھوٹ پر رکھی گئی ہے اس میں جھوٹ بول کر ہی پُرسکون زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ جس معاشرے میں مذہب، قانون اور علم کے علمبردار بھی جھوٹ بولتے ہوں، وہاں ایک ستم رسیدہ بیوہ سچ بولنے کی جرأت نہ کر سکی۔

پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو وہ خوش ہوئی کہ اب ہر چیز اور ہر انسان پاک ہو گیا ہے مگر دو تین سال کے عرصے میں اس نے دیکھ لیا کہ زمین پاک ہو سکتی ہے مگر انسانوں کی پاکیزگی مشکوک ہے۔ گاؤں میں اُس نے کئی گھروں کی خدمت کی۔ آخر ایک آدمی کی وساطت سے وہ اس قصبے میں آ گئی جہاں میں اسے ملی تھی۔ اُس نے بیک وقت تین گھروں میں نوکری کی۔ اُس نے دیکھا کہ ہر گھر میں دوسرے گھروں کی باتیں ہوتی ہیں جو مبالغہ آمیز ہوتی ہیں ... دشمن تو ہر کسی کے ہوتے ہیں۔ مائی مستانی نے دیکھ لیا کہ کون سی عورت کس عورت کو پسند کرتی اور کس عورت کو ناپسند کرتی ہے۔ وہ ہر عورت کی یہی رگ اپنی مُٹھی میں لے لیتی اور اُس کی پسند کی عورتوں کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتی اور دوسریوں کو بُرا بھلا کہنے لگتی۔

کسی کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ کرنے میں مائی مستانی کو مہارت حاصل ہو گئی اور وہ ہر گھر کے سربستہ رازوں سے واقف ہو گئی۔

"بی بی!" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "آج بڑی لمبی مدت بعد سچ بول رہی ہوں۔ میری آپ بیتی سولہ آنے سچ ہے۔ میں ایک سچ اور بولنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ مجھے ہر کوئی پسند کرتا ہے لیکن میرے دل میں کسی کی محبت نہیں۔ مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے۔ تم چھوٹی ہو بی بی! تم نہیں جانتیں کہ لوگ باہر سے جو نظر آتے ہیں وہ اندر سے ویسے نہیں ہیں۔ لوگ اپنے اوپر مذہب کا پردہ ڈال کر بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ خُدا اور رسولؐ کی قسمیں کھانے والے بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میں لوگوں کے گھروں سے چیزیں چُرا لیتی ہوں۔ اس کے باوجود ہر گھر میں مجھے عزّت اور پیار ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ان لوگوں کی دوستی اور دشمنی کے مطابق جھوٹ بولتی ہوں۔ اس سے ان کے دل کو سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ میں ان کی باتیں سُنتی ہوں اور جانتے ہوئے کہ مجھے جھوٹ سنایا جا رہا ہے میں سب کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوں۔"

"اور ان چوریوں سے تمہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟" — میں نے اُس سے پُوچھا۔

"معلوم نہیں" — اُس نے جواب دیا — "کئی چیزیں میرے کام کی نہیں ہوتیں لیکن میں نظر بچا کر اُٹھا لیتی ہوں، پھر کبھی دیکھا بھی نہیں کہ میں نے یہ چیزیں کہاں رکھ دی ہیں۔"

مائی مستانی کے اس ذہنی رُجحان کو نفسیات کی زبان میں KLEPTOMANIA کہتے ہیں۔ جس پس منظر اور جن حالات میں مائی جوان ہوئی، اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان چھوٹی چھوٹی چیزیں چُرا کر اِدھر اُدھر کر دیتا ہے۔ انہیں اپنے کام میں نہیں لاتا نہ انہیں کہیں بیچتا ہے۔

میں نے اُس سے پولیس کی مُخبر ہونے کی بات کی تو اُس نے کہا کہ میں گھر گھر کے راز جانتی ہوں۔ یہاں کے چوروں اور بدمعاشوں

کو بھی جانتی ہوں۔ مجھے اصل مجرم کا پتہ چل ہی جاتا ہے۔ میں مخبری صرف اس لئے کرتی ہوں کہ پولیس کسی بے گناہ کو نہ دھر لے۔ میرا خاوند بیگناہ پھانسی چڑھ گیا تھا۔

میں اُس کے سامنے بیٹھی بال پوائنٹ پین سے اس کی زندگی کی کہانی لکھ رہی تھی۔ میں نے اُس سے باتیں کرتے کرتے بال پوائنٹ پین رکھ دیا۔ وہ اپنی کہانی سنا کر چلی گئی اور میرا بال پوائنٹ پین جو صرف ساٹھ پیسے کا تھا، اُس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ معلوم نہیں اُس نے کس وقت میرا پین اُٹھا کر اپنے میلے کچیلے سفید بُرقعے کے اندر کر لیا اور بُرقعے کے اندر ہی اندر تھیلے میں ڈال لیا تھا۔